کنہیّا لال کپور



نازک خیالیاں

نازک خیالیاں

کنہیّا لال کپور

یونیورسل بکس

۴۰ اے اردو بازار ◎ لاہور

باراوّل ———
ناشر ——— شبیر احمد خان
مطبع ——— منظور پریس لاہور
قیمت ——— دس روپے

پرکاش پنڈت کے نام

(مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے)

فہرس

پیش لفظ

ذہین سے ذہین شخص بھی طنز و مزاح کی تشریح نہیں کر سکتا۔ شرط یہ ہے وہ رشید احمد صدیقی یا آلِ احمد سرور نہ ہو۔ اگر آپ واقعی یہ جاننے کے خواہشمند ہیں، طنز کیا چیز ہے؟ مزاح کیا ہے؟ تو ان ہر دو اصحاب سے رجوع کریں۔ بصورتِ دیگر مرزا غالب کے اس شعر پر غور فرمائیں جس میں طنز کی مکمل تشریح پیش کی گئی ہے :۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

طنز وہ میٹھی گالی ہے۔ جسے کھانے کے بعد سامع کی زبان پر بے اختیار میر کا یہ مصرع آجاتا ہے۔

کہیو پھر، ہائے کیا کہا صاحب!

مومن نے غالب کی طرح نزاکتِ آواز کو دشنامِ یار کا ایک اہم عنصر قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

نزاکتِ آواز کا تقاضا ہے کہ گالی اس نفاست کے ساتھ دی جائے جو اس کی تلخی کو گوارا بنا دے۔

ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ میر اور سودا اہم عصر تھے۔ دونوں میں چشمک رہتی تھی۔ میر نے سودا پر چوٹ کرتے ہوئے دعویٰ کیا:۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

سودا کب چُوکنے والے تھے۔ فوراً یہ مقطع موزوں کیا:۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہر گز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

ظاہر ہے سودا چوٹ کرنے کے فن میں میر سے بازی لے گئے ہیں۔ کیونکہ بطور طنز نگار وہ اس

نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ جاہل کا لفظ استعمال کئے بغیر کسی کو جاہل کہنا طنز کی معراج ہے۔

مزاح اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے۔ دوسروں پر ہنسنے کے لئے صرف ایک تنبیہ چاہیئے اپنے آپ پر ہنسنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن برگزیدہ اشخاص کو اپنے آپ پر ہنسنے کی سعادت نصیب ہوئی اُن میں غالب سرِفہرست ہیں۔ دیکھئے کس بے باکی اور بانکپن کے ساتھ وہ اپنے آپ پر ہنستے ہیں :۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

اپنے آپ پر ہنسنا ایک قسم کا سیفٹی والو (SAFETY VALVE) ہے۔ جس میں سے خودسری اور خودستائی کی وافر بھاپ خارج ہوتی رہتی ہے اور دماغی توازن قائم رہتا ہے۔ ہماری دانست میں کوئی شخص اپنی خودی یا حقیقت تب تک پہچان نہیں سکتا۔ جب تک وہ اپنے آپ پر کھل کر نہیں ہنستا۔

طنز کرنے کے لئے دماغ اور اس کی تاب لانے کے لئے جگر کی ضرورت ہوتی ہے طنز اُن ممالک میں پنپتی ہے جہاں قارئین طنزیہ تحریریں پڑھ کر طنز نگاری کی بلائیں لیتے ہیں۔ اُسے جیل یا جہنم میں بھجوانے کی دھمکیاں نہیں دیتے۔ سوداؔ نے ایک ولایتی کی ہجو کہی اُس نے خنجر نکال لیا۔ بیسویں صدی کے طنز نگار کی بے بسی دیدنی ہے جسے شہید کرنے کے لئے بچپن کروڑ ہندوستانی خنجر لئے پھرتے ہیں۔

طنز و مزاح کی مندرجہ بالا توضیح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان مضامین کو پڑھیے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ طنز کی نمائندگی کرتے ہیں کچھ مزاح کی اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی چیز کی نمائندگی نہیں کرتے، لیکن آپ کو مایوس یا بدظن ہونے کی ضرورت نہیں۔ چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی طویل غزل میں اگر پانچ سات اشعار بھی کام کے ہوں تو اُسے کامیاب غزل سمجھا جاتا ہے۔

کنہیا لال کپور

اور ابلیس نے کہا

اور وہ ایک چبوترے پر کھڑا ہو گیا اور اس نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

میں خدا کا دوست ہوں نہ اُس کا بیٹا۔ میں خدا کا اوتار بھی نہیں۔

میں تو اس کا دشمن ہوں ۔ میں خدا کی رحمت سے مایوس ہوں۔

لیکن انسان کی شفقت سے کبھی محروم نہ رہا۔

خدا نے مجھے دھتکارا۔ انسان نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ مجھے فخر ہے کہ انسان نے ہمیشہ میرے پیغام کو پیغمبروں کے پیغام پر ترجیح دی۔

تم میرا وعظ سنو۔

میں کہتا ہوں خوش قسمت ہیں امیر کہ زمین کی بادشاہت اُن کی ہے۔

سچ پوچھو تو آسمان کی بادشاہت بھی انہی کی ہے۔

خوش نصیب ہیں امیر کہ انھیں اس دنیا میں حور و غلماں دستیاب ہیں اور وہ فرانسیسی وہسکی کے جام لنڈھاتے ہیں۔ غربا کی طرح تاڑی اور ٹھرا نہیں پیتے۔

قابلِ رشک ہیں امیر کہ وہ روپے سے ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں چاہے وہ چیز کسی راہنما کا ضمیر ہو یا کسی خاتون کی عصمت۔

نہایت دانشمند ہیں امیر کہ غربا پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اور بڑے سادہ لوح ہیں غریب کہ سمجھتے ہیں کہ ان کی زبوں حالی کے لئے امیر ذمہ دار نہیں۔

قابلِ مذمت ہیں غریب کہ جن کے خیال میں سب سے بڑی دولت صبر۔ سب سے بڑا آسرا قسمت اور سب سے بڑی عیاشی فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔

بہت چالاک ہیں سرمایہ دار کہ اشتراکیت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پرولتاریوں کی حکومت میں ان کی دال نہ گلے گی۔

بڑے عجیب ہیں غریب کہ جنہیں دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر ستاتی ہے۔

اور تم سے کہا گیا خدا تمہارا آسمانی باپ ہے۔ اس کی اطاعت قبول کرو۔ لیکن آفرین کہ تم گمراہ نہیں ہوئے اور تم نے روپے کو ہی آسمانی باپ سمجھا۔

اور تمہیں یہ سبق پڑھا گیا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ رسید کرے تو اُسے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو، لیکن تم نے اس قسم کی فراخ دلی دکھانے کی کبھی غلطی نہیں کی۔ تم نے اس کے گال پر نہ ناٹے سے وہ تھپڑ رسید کئے اور آئندہ اس کی جرأت نہیں ہوئی کہ تم پر ہاتھ اٹھا سکے۔

اور تمہیں بتایا گیا خون کا بدلہ خون نہیں۔ آگ سے آگ بجھائی نہیں جا سکتی، لیکن میں کہتا ہوں جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ خون اور آگ سے ڈرتے ہیں۔ تم ان کی باتوں میں مت آؤ۔

اور تمہیں بار بار یہ تلقین کی گئی تم اپنے نفس امارہ کو مارنے کی کوشش کرو، لیکن تم نے دیکھا ایسا کرنا کتنا مشکل ہے۔ بس اسے آئندہ مارنے کی بجائے زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔

اور تمہیں سمجھایا گیا گناہوں سے توبہ کرو نہیں تو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے تو تم ان سے کہو اوّل تو ہم خدا کو منہ نہیں دکھائیں گے اور اگر دکھانا پڑا

تو منہ پر نقاب ڈال لیں گے۔

اور تمہیں آگاہ کیا گیا۔ امیر کے لئے بہشت میں داخل ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ایک اونٹ کے لئے سوئی کے ناکہ میں سے گذرنا۔ تم ان سے کہو بہشت کا دروازہ اتنا تنگ نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو رضوان کی مٹھی گرم کی جا سکتی ہے۔

اور تمہیں بتایا گیا کہ کسی پر تنقید مت کرو۔ تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے، لیکن میں کہتا ہوں محض اس ڈر سے کہ کوئی تم پر تنقید کرے گا اس دلچسپ شغل کو ترک مت کرو۔ البتہ جب تم پر کوئی تنقید کرے تو ایسا دنداں شکن جواب دو کہ وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

تم سے اکثر کہا گیا بری بات مت دیکھو۔ مت سنو۔ مت کہو۔ یعنی آنکھیں، کان اور زبان رکھتے ہوئے بھی تم اندھے، بہرے اور گونگے مت بن جاؤ۔ تم خود ہی سوچو یہ مشورہ کتنا مضحکہ خیز ہے۔

اور تمہیں بار بار اُپدیش دیا گیا کام، کرودھ، لوبھ، موہ اور اہنکار تمہارے دشمن ہیں۔ اُن سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش کرو، لیکن تم نے کبھی سوچا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا بلکہ پتھر کی مورتی یا سنگِ مرمر کا مجسمہ بن جاتا ہے۔

اور تم سے کہا گیا ہمسایوں سے محبت کرو، لیکن اگر ہمسائے لڑاکا جھگڑالو اور بدطینت ہوں تو تم ان سے کس طرح محبت کر سکتے ہو۔

اور تمہیں نصیحت کی گئی بزرگوں کا احترام کرو، لیکن جب بزرگ ضرورت سے زیادہ باتونی، بدمزاج اور دقیانوس ہوں تو ان کی عزت کون کر سکتا ہے۔

اور تم نے پڑھا جہاں عورتوں کی پوجا کی جاتی ہے وہاں دیوتا بستے ہیں

اگر وہاں دیوتا بستے ہیں تو زن مرید خاوند کہاں جاتے ہیں۔
اور تمہیں بتایا گیا جب تم پر مصیبت آئے خدا کو پکارو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے اور تم نے خدا کو بار بار پکارا۔ یہاں تک کہ تمہارا گلا بیٹھ گیا، لیکن وہ نہیں آیا۔ پس آئندہ خدا کو پکارنا بند کر دو۔ اور نزدیک ترین پولیس اسٹیشن یا یتیم خانے کو اطلاع دو۔
اور تم مدت سے سن رہے ہو اہنسا سب سے بڑا دھرم ہے، لیکن جب تک قصاب اس مقولے پر ایمان نہ لائے بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی ہے۔
اور یہ کہا گیا کہ انسان کو صرف روٹی ہی تو نہیں چاہیئے۔ یقیناً یہ قول اس شخص کا معلوم ہوتا ہے جسے کھانے کو صرف سوکھے ٹکڑے ملتے ہیں۔
اور تمہیں ہدایت کی گئی جھوٹ مت بولو۔
لیکن تجربے نے تمہیں بتایا کہ اگر سچ بولو گے تو بیوی ناراض جائے گی۔ محبوبہ روٹھ جائے گی۔ دوست دشمن بن جائیں گے۔ اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اتنے خطرے مول لینے کے بجائے سچ بولنا چھوڑ دیا۔
اور تمہیں مطلع کیا گیا ہمیشہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جس قسم کے سلوک کی تم ان سے توقع رکھتے ہو، لیکن چونکہ تم دوسروں کے باطن کا حال نہیں جانتے تھے اس لئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیسے کر سکتے تھے۔
اور تم سے کہا گیا خدا کی عبادت کرو۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد اور مریضوں اور غریبوں کی خدمت کرو۔ ظاہر ہے یہ تمام کام تم بیک وقت نہیں کر سکتے تھے اس لئے تم نے کوئی کام بھی نہیں کیا۔
اور یہ دعویٰ کیا گیا جیو اور جینے دو۔ ایک سنہرا اصول ہے، لیکن تم جانتے تھے اگر تم نے دوسروں کو جینے دیا تو کچھ عرصے بعد وہ تمہیں جینے نہیں دینگے۔

اس لئے تم نے انھیں جینے کا موقع ہی نہیں دیا۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حقیقت کی دنیا میں رہتے ہیں اور جو انسان کو انسان نہیں بلکہ ایک نہایت مکّار اور خوں خوار جانور سمجھتے ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کا عقیدہ ہے کہ بندر، گھوڑے اور ریچھ کو سدھایا جا سکتا ہے لیکن انسان کو نہیں۔

پس تم مجھ پر ایمان لاؤ۔ میں تمہیں نجات تو نہیں البتہ بے پناہ دولت، خوبصورت عورتیں اور شراب دوں گا۔ یاد رکھو۔ مجھ سے پہلے اور میرے بعد کئی پیغمبر آئے، لیکن انسان کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے، کیونکہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ استرے کی تیز دھار پر چلنا، لیکن جس راستے پر چلنے کی میں تمہیں ترغیب دے رہا ہوں۔ اس پر چلنا اتنا ہی آسان ہے جتنا فرشِ مخمل یا پھولوں کے تختوں پر چلنا۔ تم کہوگے یہ راستہ ہمیں جہنم کے دروازے تک لے جائے گا۔ میں کہوں گا تم خواہ مخواہ خوف زدہ ہو رہے ہو۔ اول تو جہنم کس نے دیکھا ہے۔ اور بالفرض.....
اگر واقعی جہنم کا وجود ہے تو وہ اس جہنم سے قطعاً مختلف ہوگا جس کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ آخر خدا اتنا سنگدل نہیں ہو سکتا کہ ایک بار تمہیں جہنم میں جھونکنے کے بعد پھر تمہاری سدھ بدھ ہی نہ لے۔

اس لئے مجھ پر بھروسہ رکھو اور مجھے بندوں میری امامت قبول کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے تو یقیناً ریاکار کہلاؤ گے۔ کیونکہ تم ایمان تو پیغمبروں پر لاتے ہو، لیکن دراصل دم میرا بھرتے ہو۔

غالبؔ کے اُڑینگے پُرزے

باغِ بہشت میں مرزا غالبؔ اپنے محل میں ایک پُر تکلف مسند پر بیٹھے دیوانِ غالبؔ کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ اچانک باہر سے نعروں کی آواز آتی ہے ــــــ غالبؔ کے ..... اُڑیں گے پُرزے۔ غالبؔ کے ..... اُڑیں گے پُرزے۔ مرزا گھبرا کر لاحول پڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ یہ لوگ جنت میں بھی چین نہ لینے دیں گے۔ پھر خدمت گار کو حکم دیتے ہیں باہر جاکر پتہ لگاؤ یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ خبر لاتا ہے کہ "غالب شکنوں" نے ایک جلوس نکالا ہے جس کی رہنمائی یاس یگانہ اور طبا طبائی کر رہے ہیں اور یہ جلوس شہنشاہ سراج الدین ابوظفر کے محل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اتنے میں "دیوانِ غالب" کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں پُرزے فضا میں اُڑتے ہوئے مرزا کے محل میں گرتے ہیں وہ ان کو اٹھاتے ہیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان پر ان کے اشعار کے علاوہ کچھ اور بھی لکھا ہے۔

ــــــ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے ــــــ خوب! معشوق نہ ہوا مرغی ہوئی جو راکھ کرید رہی ہے۔ کریدنے کا لفظ یہاں کتنا غیر مناسب ہے (طباطبائی) ــــــ پوچھو وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے۔

______ واہ صاحب واہ! خدا کا شکر کیجئے کہ بوجھ سر سے گر پڑا ہے اب اُسے پھر اُٹھا کر گردن تڑوانے کا ارادہ ہے کیا؟ ______

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ______ اجی صاحب! کس کا دیدۂ تر؟ اپنا؟ رقیب کا؟ یا محبوب کا؟ ______ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا ______

یک نہ شُد دو شُد۔ بھئی کس کا سر یاد آیا؟ مجنوں کا؟ اپنا؟ یا شیخ ابراہیم ذوق کا؟ ______ دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ______

کس کو دونوں جہان دے کر کون خوش رہا؟ یہ معمّہ ہے یا مصرع؟ ______

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے ______ یہ بھی خوب رہی۔ بجھ شمع رہی ہے۔ اور دھواں "میں" سے نکل رہا ہے (مجاز لکھنوی)

______ اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد ______ کیوں صاحب! اگر محروم حنا میرے بعد لکھ دیتے تو کیا حرج تھا ______

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب ______ خدا لگتی کہئے اس غزل میں آپ نے تصوف کی کون سی رمز بیان کی ہے اور ہم آپ کو کیسے ولی سمجھ لیں۔ کیا تیرِ نیم کش میں تصوف سمو یا گیا ہے یا مرکر رسوا ہونے میں؟ ______

______ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ______ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا ______

وہ رقیب ہی کیا جس کے مقدر میں محبوب کی گالیاں لکھی ہوں۔ پھر آپ اور رقیب میں فرق ہی کیا رہا؟ ______ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز ______

یہ بھی بتا دیا ہوتا وہ اندیشہ ہائے دور دراز کیا ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے وہ اپنی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں اور آپ انھیں نظر بھر کر دیکھ رہے ہیں۔ آئینے میں ہی! ______ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ______

یہ بات کیا بنی۔ اگر آساں نہیں تو سہل کیسے ہے؟ ______

۔اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے ــــ کیا ٹھانی ہے؟ کیا امراؤ بیگم کو طلاق دینے کا ارادہ ہے یا ستم پیشہ ڈومنی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔

ــــ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ــــ ظاہر ہے کہ مے نوشی کی وجہ سے آپ کا اعصابی نظام کمزور پڑ گیا ہے۔ نیند کیسے آئے؟ ــــ

ــــ موت آتی ہے پر نہیں آتی ــــ جب آتی ہے اُسے روک کیوں نہیں لیتے؟ ــــ لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں۔ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ــــ ہاتھ قلم ہوجانے کے بعد کیا پیر سے لکھتے رہے۔ (طباطبائی) ــــ بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے ــــ کون کس کو اشارے کرتا رہا ــــ آپ؟ رقیب؟ یا محبوب؟

غالب ان گستاخانہ تبصروں کو پڑھ کر زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ اب وہ چند اور تجزیے ملاحظہ فرماتے ہیں۔ "غالب کے نزدیک شاعری ذہنی عیاشی کا بدل ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اپنے بارے میں لکھا۔ عمر بھر وہ غمِ عشق کا رونا روتے رہے۔ کاش انہیں معلوم ہوتا ــــ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

"غالب نے جی بھر کر عشق کیا عموماً خیالی محبوبوں سے۔ جس قدر مے ملی ہر شب پیتے رہے۔ عموماً قرض کی۔ پھر بھی انھیں شکایت رہی کہ ان کے ارمان بہت کم نکلے۔ اللہ اللہ کتنے بے صبر اور ناشکرے تھے وہ!"

غالب اس پرزے کو پڑھ کر خوب ہنستے ہیں اور اب ایک بہت بڑا پرزہ اٹھاتے ہیں "وہ جسے ہم انگریزی میں سٹریم آف کانشس نیس STREAM OF CONSCIOUSNESS کہتے ہیں مرزا کی تمام

غزلوں میں رواں دواں ہے۔ مثال کے طور پر ان کی مشہور غزل لیجئے جس کا مطلع ہے :-
کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

ظاہر ہے ایام غدر میں وہ چاندنی چوک سے گزر رہے ہیں اور انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ان کی کسی امید کے بر آنے کا امکان نہیں۔ چاندنی چوک میں وہ سناٹا ہے کہ کہیں کوئی اچھی صورت نظر نہیں آ رہی۔ یک لخت ان کا خیال گوروں کے ہاتھ ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ کی طرف جاتا ہے اور وہ پوچھتے ہیں جب مرنا برحق ہے تو پھر گوروں کے ڈر سے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔ گوروں سے ان کا تخیل اپنے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ حالی کو دل ہی دل میں جھڑک کر کہتے ہیں ـــــــ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ـــ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

پھر وہ سوچتے ہیں یہ حالی بہت بڑا الو ہے، لیکن امراؤ بیگم نے مدت سے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ کیوں نہ اُسے ایک دن کھری سنائی جائیں۔ پھر ڈرتے ہیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، اس لئے فرماتے ہیں

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

چونکہ وہ نشہ میں ہیں۔ اس لئے انھیں مطلقاً علم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ اپنی مضحکہ خیز حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ـ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ معاً انہیں یاد آتا ہے کہ ظفر نے انہیں حج پر ساتھ لے چلنے کی پیش کش کی تھی، لیکن وہ رندِ شاہد باز ہیں، اس لئے ان کا حج قبول نہیں ہوگا۔ کفِ افسوس ملتے ہوئے فرماتے ہیں :-

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اپنی غزل کی یہ تاویل سن کر مرزا ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں، لیکن اُس سے اگلا پرزہ پڑھ کر ان کی ہنسی سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "غالب شاعر نہیں افسانہ نگار تھے"۔ انھیں مختصر ترین افسانے لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے کچھ افسانے تو اپنے اختصار اور اپنی افسانویت کے باعث شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(نوٹ) اس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ جن کے زہد کی دہلی میں دھوم ہے۔ کل چوری چھپے شراب پیتے پکڑے گئے۔ ایک اور افسانے میں انہوں نے پاسباں کے ہاتھوں اپنے پٹ جانے کے واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اور مندرجہ ذیل شعر تو ایک اچھے خاصے نفسیاتی ناول کا موضوع بن سکتا ہے:۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس سے اگلا پرزہ انہیں سر پیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس۔ دوسرا دیوانِ غالبؔ"۔ مرزا غالبؔ نے اپنے بہترین اشعار میں وید منتروں کی بہت عمدہ تفسیر کی ہے۔ رگ وید میں ایک

منتر آتا ہے جس کا مفہوم ہے انسان بنو۔ مرزا فرماتے ہیں:۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یجر وید میں کہا گیا ہے خدا کی ذات کے سوا تمام چیزیں ہیچ اور معدوم ہیں۔ مرزا اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اتھروید کے ایک منتر میں تلقین کی گئی ہے کہ یہ دنیا مایا ہے۔ غالبؔ نے اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مرزا اپنا سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ دو ایک منٹ کے سکوت کے بعد کہتے ہیں "توبہ توبہ۔ غالب اور ویدوں کا مفسر ـــــ" سفید جھوٹ کی اس سے بڑی مثال مشکل سے ملے گی۔ یا خدا! یہ میں نے کیا کیا۔ کیوں خواہ مخواہ بھینس کے آگے بین بجائی۔ یہ پرزے پڑھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے میرا دیوان ایک گورکھ دھندا ہے۔ ارے بھئی میاں مہدی حسین مجروحؔ۔ شیفتہؔ، ہرگوپال تفتہؔ ذرا ادھر آؤ۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو میرے دیوان کی کیا گت بنائی جارہی ہے۔

یک لخت دروازے پر دستک ہوتی ہے اور اندر آنے کی اجازت ملنے پر منشی ہرگوپال تفتہ داخل ہوتے ہیں۔

"آداب عرض پیر و مرشد! مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔"

"منشی ہر گوپال تفتہ۔ دیکھ نہیں رہے ہو میرے پرزے اُڑائے گئے ہیں اور تم مبارک باد پیش کر رہے ہو۔ گویا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔"

"پیر و مرشد! میں جانتا ہوں جن گستاخ ہاتھوں نے آپ کے پرزے اڑائے اور یہ بھی جانتا ہوں ان کا حشر کیا ہوا۔"

"حشر کیا ہونا تھا۔ سنا ہے وہ شہنشاہ ظفر کے محل میں پہنچے اور انہیں طعنہ دیا کہ انھوں نے مجھ ایسے ہیچ مداں کو کیوں منہ لگا رکھا تھا۔"

"گستاخی معاف مرزا آپ نے غلط سنا۔ جلوس کو شہنشاہ کے محل تک پہنچنے ہی نہیں دیا گیا۔ فرشتوں کی ایک خاص ٹکڑی نے اُسے حراست میں لے لیا۔"

"حراست میں لے لیا! پھر اُسے کہاں لے گئے۔؟"

"داورِ محشر کی عدالت میں۔"

"پھر؟"

"باری تعالیٰ نے جلوس کے رہنماؤں کو سخت ترین سرزنش کرنے کے بعد فرمایا۔ وجہ بیان کرو کہ غالبؔ شکنی کے جرم میں ابھی کیوں نہ تمہارے پرزے اڑا دیئے جائیں۔"

"اور بھی کچھ کہا؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے مزید فرمایا۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو عالمِ فانی میں منائی جا رہی ہے دارالبقاء میں دیوانِ غالب کو سونے کے حروف میں شائع کیا جائے اور ہماری ذاتی لائبریری میں اُسے وہی مقام دیا جائے جو کلیاتِ شیکسپیئر، کلیاتِ کالی داس اور کلیاتِ ڈانٹے

کو حاصل ہے:"

"خالقِ کون و مکاں! تمہارا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

غالب سجدے میں گر جاتے ہیں اور جب اٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ "دیوانِ غالب" کے پرزوں نے خوبصورت اوراق کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جن پر ان کی غزلیں سونے کے حروف میں لکھی گئی ہیں۔

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ

"دھرنوں" کا موسم تھا۔ جگہ جگہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھے تھے۔ ایک برات نے جو شکارپور سے آئی تھی سیٹھ لکشمی چندر کی کوٹھی کا محاصرہ کر رکھا تھا اس کا مطالبہ تھا کہ سیٹھ صاحب اپنی خوبصورت اور اکلوتی بیٹی کی شادی اس دولہا کے ساتھ کر دیں جو برات لے کر آیا تھا۔ سیٹھ صاحب کا کہنا تھا کہ وہ دولہا کو بالکل نہیں جانتے۔ انہیں اس کے حسب نسب کا مطلقاً علم نہیں اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ دولہا نہایت بدصورت تھا۔ کالا بھجنگ۔ چیچک رو اور لم ٹنگو، لیکن برات کی رائے میں یہ سب باتیں خارج از بحث تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ برات نے دھرنا دیا تھا اور دھرنا عموماً کسی بیہودہ مطالبہ کو منوانے کے لئے ہی دیا جاتا ہے۔ سیٹھ صاحب نے پولیس کو برات کے ارادے سے مطلع کیا، لیکن پولیس نے ایک خاص ذاتی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے کمشنر سے رجوع کیا جس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ برات کا مطالبہ منظور کر لیں ورنہ شہر میں گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سیٹھ صاحب کمشنر کا ردعمل دیکھ کر بہت سٹپٹائے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس قسم کا غیر معقول مطالبہ کس طرح منظور کر سکتے ہیں۔ ادھر کمشنر صاحب انہیں

سمجھاری ہے بیٹھنے کہ دھرنے اور موت کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی، اس لئے وہ خواہ مخواہ ضد نہ کریں۔

"ضد میں کر رہا ہوں یا براتی؟" سیٹھ صاحب نے تلملا کر پوچھا۔

"اگر آپ کا اس سے پہلے کبھی دھرنے سے پالا پڑا ہوتا تو آپ ایسا کبھی نہ کہتے۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے اپنی مرضی کے خلاف اپنی بیٹی کی شادی اس نامعقول سے کرنا پڑے گی۔"

"اور بچارہ کار بھی کیا ہے۔"

"یہ عجیب بے بسی ہے۔"

"جب سے دھرنا ایجاد ہوا ہے بے بسی تو ایک عام سی چیز ہو گئی ہے۔ یقیناً آپ اپنے کو بے بس محسوس کرتے ہیں اکیلے نہیں ہیں۔"

"لیکن حکومت دھرنوں کا انسداد کرنے کے لئے کیا کر رہی ہے؟"

"وہ بھی آپ کی طرح بے بس ہے۔"

"اس کا مطلب ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔"

"جی ہاں بشرطیکہ وہ لاٹھی دھرنا ہو۔"

یونیورسٹی کیمپس پر پانچ سو فیل شدہ طلباء نے وائس چانسلر کی کوٹھی پر دھرنا دیا تھا۔ ان کا مطالبہ سیدھا سا تھا۔ یعنی انہیں پاس کر دیا جائے اور جن ممتحنوں نے انھیں فیل قرار دیا ہے انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ وائس چانسلر فرما رہے تھے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ طلباء انہیں یقین دلا رہے تھے کہ جب تک اُن کی بات مانی نہیں جاتی وہ اپنا دھرنا جاری رکھیں گے۔ وائس چانسلر صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ جب انھوں نے ساتویں بار طلباء کو

بتایا کہ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تو انہوں نے کہا "آپ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب دھرنا ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں ہر ایک چیز ممکن ہے۔ یہاں تک کہ اگر طلباء ملک الموت کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جائیں تو انہیں بھی اُس روح کو واپس کرنا پڑے گا۔ جو اس نے قبض کی ہے۔"

آخر وائس چانسلر نے محض جان چھڑانے کے لئے کہا۔ "مجھے کچھ مہلت دیجئے۔ میں جلد ہی سنڈیکیٹ کا اجلاس طلب کر دوں گا۔ جس میں تمہارے مطالبہ پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔" لیکن طلباء بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انھوں نے اس تجویز کو فوراً رد کر کے الٹی میٹم دے دیا۔ اگر آج دوپہر تک ان کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو وہ یونیورسٹی ہال کے علاوہ وائس چانسلر کی کوٹھی کو بھی آگ لگا دیں گے۔

ایک بہت بڑے بینک کے ملازموں نے اپنے مینجر کا "گھیراؤ" کر رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کام کے اوقات میں پچاس فیصد تخفیف کی جائے۔ نیز ایک ہفتہ میں ایک اتوار کی بجائے دو اتوار ہونے چاہئیں۔ مینجر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "یہ دونوں باتیں میرے اختیارات سے باہر ہیں۔ آپ جنرل مینجر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جائیں۔" لیکن ملازمین بضد تھے کہ وہ اپنے مطالبے اسی سے منوا کر دم لیں گے۔ مینجر نے ان سے دست بستہ درخواست کی "خدا کے لئے مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ میری بیوی سخت بیمار ہے اور گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔" ملازموں نے چنگھاڑ کر کہا "تمہاری بیوی مرے یا بچے۔ تمہارے بچوں کو کھانا ملے یا وہ بھوکے رہیں۔ ہم تو اپنے مطالبے منوانے کے بعد ہی تمہیں یہاں سے اٹھنے کی اجازت دیں گے۔"

ایک چوراہے میں ایک شخص آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے دائیں اور بائیں پٹرول اور مٹی کے تیل کے کنستر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ جو نوبل پرائز آئرلینڈ کے ادیب سیموئیل بیکٹ کو اس سال دیا گیا اس کا اصل میں حقدار میں ہوں۔ یہ انعام بیکٹ سے واپس لیا جائے اور مجھے دیا جائے۔ اگر ایک ہفتے کے اندر ایسا نہ کیا گیا تو میں اپنے کپڑوں پر پٹرول یا مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں آگ لگا دوں گا اور زندہ جل مروں گا۔

اس سے جب پوچھا گیا "تم اپنے کو کس اعتبار سے سیموئیل بیکٹ سے بہتر ادیب سمجھتے ہو" تو اس نے جواب دیا "جس ڈرامے پر بیکٹ کو انعام دیا گیا۔ اس کی ضخامت اسی صفحے ہے اور اس میں صرف چار کردار ہیں۔ جو ڈرامہ میں نے لکھا ہے اس کی ضخامت دو سو چالیس صفحے ہے اور اس میں چوبیس کردار ہیں۔"

اُس شخص کے قریب ہی پیپل کے درخت کے نیچے ایک شخص نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ اس کا مطالبہ تھا جب تک دہلی کی بجائے بنگلور کو ہندوستان کا دارالخلافہ نہیں بنایا جاتا۔ وہ بھوک ہڑتال جاری رکھے گا۔

کسی نے اس سے سوال کیا "دہلی میں کیا قباحت ہے؟" اُس نے جواب دیا "دہلی مجھے بالکل پسند نہیں۔ دہلی رہنے کے لئے مکان ملتا ہے نہ سوار ہونے کے لئے بس۔ کبھی ہندوستان کا دارالخلافہ کلکتہ تھا جو کہ مشرقی ہندوستان میں واقع ہے۔ پھر یہ شمالی ہندوستان میں منتقل ہو گیا۔ اب جنوبی ہندوستان کو موقع ملنا چاہیئے۔"

ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے نزدیک تین سو افراد ریلوے لائن پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کا مطالبہ تھا جب تک ریلوے کے اعلیٰ احکام یہ احکام صادر نہیں کرتے کہ آئندہ ہر "میل" اور "ایکسپریس" گاڑی اُن کے اسٹیشن پر بھی ٹھہرا کرے گی وہ کسی گاڑی کو آگے نہیں جانے دیں گے۔ اُن سے سوال کیا گیا۔ "اگر میل یا ایکسپریس ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرے گی تو پھر وہ میل یا ایکسپریس کیسے رہے گی"۔ انہوں نے بڑی بے رُخی کے ساتھ جواب دیا۔ "ہم کب کہتے ہیں کہ وہ ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرے۔ ہم تو اُسے صرف اپنے اسٹیشن پر ٹھہرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

ایک محلے میں بیویوں نے شوہروں کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ آئندہ شام کا کھانا شوہروں کو تیار کرنا پڑے گا۔ بیویاں کلب یا سینما جایا کریں گی اور رات گئے گھر لوٹیں گی۔

کچھ بیویوں نے جو ضرورت سے زیادہ "ماڈرن" واقع ہوئی تھیں یہ تجویز پیش کی کہ بچے کی پیدائش کی ذمہ داری بھی شوہروں کو سونپ دی جائے، لیکن اکثریت کا یہ خیال تھا کہ یہ مطالبہ ناجائز ہے۔ اس کے لئے تو قدرت کے خلاف مورچہ لگانا پڑے گا۔

ایک مشہور اخبار کے خاص نمائندہ نے یہ تمام دھرنے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس نے سوچا "سبحان اللہ! یہ دھرنا بھی کیا دلچسپ ایجاد ہے جس کی بدولت ہر مراد بر آتی ہے۔ روٹھوں کو منانا ہو تو دھرنا، سنگدل سے سنگدل محبوب کو راہ پر لانا ہو تو دھرنا ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہو تو دھرنا۔ دھرنا کیا ہے اچھا خاصہ الہ دین کا چراغ ہے۔ معاً اُسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی اخبار کے مالک کو الٹی میٹم دیدے کہ اگر اُسے دو ایک دن میں چیف ایڈیٹر نہ بنایا گیا تو وہ اخبار کے دفتر کی سہ منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا۔

بلیس سو ستّر

ہندوستان کی تاریخ میں ۲۰۷۰ء بڑا عجیب اور اہم سال تھا۔ اس سال پوری ایک صدی کے بعد خاندانی منصوبہ بندی رنگ لائی۔ ملک کی آبادی پچپن کروڑ سے گھٹ کر پچپن لاکھ رہ گئی، لیکن ادھر آبادی کم ہوئی اُدھر سیاسی جماعتوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اب ان کی تعداد پانچ سو پچپن تھی۔ حالانکہ ۱۹۷۰ء میں صرف پچپن پارٹیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشہور سیاسی جماعتوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے متعدد پارٹیوں کو جنم دیا ہے۔ مثال کے طور پر "تلوار پارٹی" کو ہی لیجئے۔ اس کی چودہ اولادیں ہوئیں جن میں سے "تیز تلوار پارٹی"، "کند تلوار پارٹی"، "زنگ خوردہ تلوار پارٹی" قابلِ ذکر ہیں۔ "پاگل پارٹی" کے بچوں کی تعداد اکیس تھی جن میں سے چند کے نام تھے "نیم پاگل پارٹی"، "تین بٹہ چار پاگل پارٹی"، "پانچ بٹہ چھ پاگل پارٹی"، "ننانوے فیصد پاگل پارٹی"۔ جہاں تک "لچر پارٹی" کا تعلق ہے۔ اُسے ستّیس پارٹیوں کا خالق ہونے کا فخر حاصل تھا۔ جن میں سے "لچر لچر پارٹی"، "لچر تر پارٹی"، "لچر ترین پارٹی" نے دیارِ ہند میں اپنا مقام پیدا کیا۔ ایک مختصر سے مضمون میں ان تمام پارٹیوں کا تعارف ناممکن ہے، اس لئے صرف چند پارٹیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پستول پارٹی: (الیکشن نشان کارتوس) یہ ۱۹۸۰ء کی مشہور پارٹی کی

(جس کا نام ریوالور تھا) پڑ پوتی تھی۔ اس کا نعرہ تھا ــــــ اُٹھ ساقی اُٹھ پستول چلا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جس شخص کو دلائل سے قائل نہیں کیا جا سکتا اُسے پستول سے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ موت کے بعد کوئی شخص بحث نہیں کر سکتا۔ یہ پارٹی سمجھتی تھی کہ ہندوستان کے تمام مسائل کا علاج پستول ہے۔ اگر ہر شخص کے ہاتھ میں پستول تھما دیا جائے تو وہ اپنی روزی کا بندوبست خود کرے گا اور اس طرح خوراک اور بے روزگاری کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

بندوق پارٹی (الیکشن نشان 'تھری ناٹ تھری') اس پارٹی کے اراکین پہلے پستول پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے پارٹی کے خلاف بغاوت کر کے ایک نئی پارٹی قائم کی۔ اس پارٹی کی رائے میں ہندوستان کو پستول کی نہیں بندوق کی ضرورت تھی۔ اس پارٹی کا دعویٰ تھا کہ جتنے اشخاص پستول پارٹی نے ایک سال میں ہلاک کئے۔ اُن سے زیادہ اُس نے ایک ہفتہ میں کئے۔ اس پارٹی کا نعرہ تھا "بندوقا پر موددھرما"۔

دھماکا پارٹی (الیکشن نشان 'بارود') اس پارٹی کے اراکین کا صرف ایک شغل تھا یعنی ہر روز کہیں نہ کہیں دھماکا ہونا چاہیئے۔ کسی بلڈنگ، کسی چھت، کسی دیوار کو ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اُڑنا چاہیئے۔ اس پارٹی سے ریلوے اسٹیشن، ڈاکخانے، تارگھر خاص طور پر پناہ مانگتے تھے۔ کیونکہ اسے اس قسم کی عمارتوں سے "الرجی" تھی۔ اس پارٹی کا نعرہ تھا "ہم اپنی تخریب کر رہے ہیں ہماری وحشت کا کیا ٹھکانا!"

پراچین سنسکرتی پارٹی (الیکشن نشان 'جنگل') اس پارٹی کا نعرہ تھا۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!ــــ یہ پارٹی پتھر اور دھات کے زمانے کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے ہوائی جہاز،

ٹیلی ویژن اور لپ اسٹک سے سخت نفرت تھی۔ یہ چھکڑے، رتھ اور پان کی دلدادہ تھی۔ اس کے خیال میں وقت کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں بانٹنا سراسر غلط تھا۔ صحیح تقسیم یہ تھی۔ ماضی، ماضی، ماضی۔

خونخوار پارٹی (الیکشن نشان "بھیڑیا") یہ پارٹی طاؤس ورباب کی بجائے شمشیر وسناں کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا، عوام بھیڑیں ہیں پہلے ان سے ووٹ حاصل کرو پھر ان پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑو۔ اگر وہ شکایت کریں تو انھیں طعنہ دو کہ بھیڑیوں کو ووٹ دو گے تو تمہارا یہی حشر ہوگا۔

مکار پارٹی (الیکشن نشان 'لومڑی') اس پارٹی کا دعویٰ تھا کہ کامیاب سیاست داں وہ ہوتا ہے جو لومڑی اور گرگٹ کا مرکب ہو — جو غریبوں کے ساتھ ہمدردی جتائے، لیکن ساتھ ہی ان کا خون چوسے۔ جو عوام کی خدمت کرنے کا حلف اٹھائے، لیکن دراصل اپنے کنبے کی خدمت کرے۔ جو پلیٹ فارم پر جنتا کی محبت کا دم بھرے، لیکن درپردہ انھیں لوٹنے کے منصوبے بنائے۔ جو عوام کو دس بار دھوکا دینے کے بعد گیارہویں بار دھوکا دینے کے لئے تیار رہے اور جو دن رات اقبالؔ کا یہ مصرع گنگنائے۔

کافر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

غدار پارٹی (الیکشن نشان 'مارِ آستین') ملک اور قوم سے غداری کرنا اس پارٹی کا شیوہ تھا۔ یہ پارٹی جس تھالی میں کھاتی تھی اُسی میں چھید کرتی تھی۔ اس پارٹی کے اراکین کا شجرۂ نسب جعفر اور صادق سے ملتا تھا۔ جن کے متعلق اقبالؔ نے کہا تھا ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ ملّت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ضمیر فروش پارٹی (الیکشن نشان 'ابلیس') یہ پارٹی اپنے ضمیر کو نیلام کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اس کی دانست میں جو شخص اپنے ضمیر کو فروخت نہیں کرتا تھا وہ ہمیشہ تنگدست اور بدحال رہتا تھا۔ اس پارٹی کے اراکین کھلے بندوں خریداروں کو بولی دینے کے لئے کہتے اور سب سے بڑی بولی پر اپنا ضمیر فروخت کر کے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے تو کہتے تھے منہ پر نقاب ڈال لیں گے۔

بے غیرت پارٹی (الیکشن نشان 'چکنا گھڑا') یہ پارٹی ہر بار الیکشن میں ناکارہ رہتی تھی، لیکن الیکشن لڑنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس پارٹی کے ہر رکن کی ضمانت ضبط ہو جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود اسے یقین رہتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوں گا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالوں گا۔

نہایت بے غیرت پارٹی (الیکشن نشان 'گیجی چاند') اس پارٹی کا صرف ایک رکن تھا جو خود ہی پریذیڈنٹ، جنرل سکریٹری اور خزانچی تھا اور جس کو الیکشن میں صرف ایک ووٹ ملتا تھا۔ یعنی اپنا ہی ووٹ۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے اس پارٹی کے دو اراکین تھے۔ بعد میں ان میں جھگڑا ہو گیا اور دوسرے رکن نے اپنی علیحدہ پارٹی بنالی جس کا نام غایت درجہ بے غیرت پارٹی۔

گرگٹ پارٹی (الیکشن نشان 'گرگٹ') اس پارٹی کا نعرہ تھا ___ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے! اس پارٹی کے اراکین صبح کو مکار، دوپہر کو خونخوار، شام کو غدار اور رات کو بدکار کہلاتے تھے۔

انھیں اس بات پر ناز تھا کہ جس سرعت کے ساتھ ہم پارٹی بدلتے ہیں، لوگ قمیص بھی نہیں بدلتے۔ معمولی سے معمولی لالچ کی خاطر یہ اپنے احباب کو آنکھیں دکھا کر اغیار کی جماعت میں شامل ہو جاتے تھے۔ عموماً اپنی صفائی میں علامہ اقبال کا مصرع پیش کیا کرتے تھے۔ ؏

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خود غرض پارٹی

(الیکشن نشان "جنگلی سؤر") اس پارٹی کے اراکین ملک اور قوم کے مفاد کو ذاتی مفاد پر قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ الیکشن جیتنے کے بعد اُن میں سے ہر شخص وزیر اعلیٰ بننے کی کوشش کرتا اور جب اپنی کوشش میں ناکام رہتا تو وزارت کا تختہ پلٹنے کی کوشش کرتا۔ اور عموماً کامیاب ہو جاتا۔ اس کے بعد داغ دہلوی کا یہ مصرع زبان پر لاتا۔ ؏

ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

(نوٹ) بظاہر یہ پارٹیاں مختلف تھیں۔ ان کے الیکشن نشان مختلف تھے، ان کے نعرے مختلف تھے، اصول مختلف تھے، لیکن ان سب کا نصب العین ایک تھا۔ یعنی قلیل سے قلیل مدت میں ہندوستان کو تباہ و برباد کیا جائے۔ چنانچہ ان کی مشترکہ امیدیں ۲۰۷۵ء میں بر آئیں اور ہندوستان کا نام لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹا دیا گیا اور اس کے ساتھ ان پارٹیوں کا مادی اور سیاسی وجود بھی ختم ہو گیا!!

ڈاکٹر بالغ

اگر صرف ایک فقرے میں ڈاکٹر بالغ کا تعارف کرانا مقصود ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے سب سے بڑے غالب شناس ہیں اور سچ تو یہ ہے انہیں یہ سعادت یونہی نصیب نہیں ہوئی۔ گزشتہ پچیس برس سے وہ غالب، خاص کر دیوانِ غالب پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پانچسو صفحات لکھ چکے ہیں جو بقول ان کے محض تمہید کے طور پہ تحریر کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر بالغ اگر چاہتے تو اس طویل تمہید میں اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ کر قارئین کا وقت ضائع کر سکتے تھے، لیکن خدا کا شکر ہے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ان پانچ سو صفحات میں ساڑھے چار سو اپنی ذات کے لئے وقف کئے ہیں، لیکن باقی پچاس میں غالب سے متعلق واقعی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "شروع شروع میں تو میں سمجھتا رہا کہ دیوانِ غالب کا مصنف مرزا ہر گوپال تفتہ ہے۔ کیونکہ غالب کو شطرنج کھیلنے اور "اک گونہ بے خودی" سے جو اُن پر دن رات طاری رہتی تھی۔ فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ شعر کہہ سکیں۔ انہوں نے اپنے شاگردِ رشید مرزا تفتہ سے فرمائش کی ہوگی کہ ان کے لئے ایک دیوان تیار کریں جس کا نام دیوانِ غالب ہو، لیکن دو سال اس تھیوری پر کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ تب میں نے قیاس لگایا کہ دیوانِ غالب

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی تصنیف ہے۔ تین سال اس تھیوری پر تحقیق کرتا رہا۔ جب یہ بھی غلط ثابت ہوئی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوانِ غالبؔ کو دو شعراء نے مل کر لکھا اور وہ تھے اسدؔ اور غالبؔ، اس لئے دیوانِ غالبؔ کی بجائے اسے دیوانِ اسدؔ و غالبؔ کہنا چاہیئے۔ تحقیق کے دوران دو ایک بار مجھے شک ہوا کہ دیوانِ غالبؔ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ لفظ "بالغ" میں غالبؔ کے تمام حروف شامل ہیں اور اگر غالبؔ کے مقطعوں میں بالغؔ پڑھا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً ؎

عشق نے بالغؔ نکمّا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر یک لخت مجھے یاد آیا کہ میں سرے سے شعر ہی نہیں کہہ سکتا، اس لئے دیوانِ غالبؔ کا مصنّف کس طرح ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر بالغؔ کی رائے میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ غالبؔ کے دو تخلّص تھے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں "کوئی درباری شاعر دو تخلص کس طرح کر سکتا تھا۔ کیا باقی شعرا یہ اعتراض نہ کرتے کہ جہاں مقطع میں غالبؔ بطور تخلص نہیں لایا جا سکتا وہاں اسدؔ لایا جا رہا ہے جو کہ اصولِ غزل گوئی کے سراسر خلاف ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اسدؔ اور غالبؔ جگری دوست تھے۔ انہوں نے مل کر دیوان چھپوانے کا قصد کیا۔ کیونکہ دونوں کا شعری سرمایہ بے حد قلیل تھا۔ اگر علیحدہ علیحدہ دیوان چھپواتے تو اوّل تو وہ اپنی مضحکہ خیز ضخامت کی وجہ سے مقبول نہ ہوتا۔ دوسرے مصارف بھی زیادہ کرنے پڑتے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر بالغؔ فرماتے ہیں "بہر حال اگر تمامِ حُجّت کی خاطر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اسدؔ اور غالبؔ ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں تو یہ عین مناسب

ہوگا کہ اب تمام مقطعوں میں اسد یا غالب کی بجائے 'مرزا' کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اسے دو کی بجائے ایک شاعر کا کلام سمجھیں۔ غالب اور مرزا ہم وزن الفاظ ہیں، اس لئے جن مقطعوں میں غالب تخلص آیا ہے وہاں مرزا لکھ دینے سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ مثلاً ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان مرزا
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

البتہ اسد کی بجائے مرزا لکھتے وقت مصرعوں میں معمولی تصرّف کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر ؏

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

کی بجائے یہ لکھنا ہوگا ؏

ہستی کے مت فریب میں اے مرزا آئیو

اسی طرح ؏

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد

کی نئی صورت یہ ہوگی ؏

خوبرویوں کو ہیں مرزا چاہتے

ڈاکٹر بانگ کی تحقیق کے مطابق کاتب کی غلطی سے دیوان غالب میں متعدد اشعار غالب کے معاصرین کے شامل ہو گئے ہیں۔ اُن کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "کیا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس یہ باور کر سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار غالب کے ہیں ؎

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مولانا حالی کے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب کو حالی بہت عزیز تھے، اس لئے انہوں نے از راہِ محبت یہ اشعار اپنے دیوان میں شامل کر لئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اشعار مولانا حالی کے اصرار پر شامل کئے گئے ہوں۔ تاکہ سارے دیوان میں دو شعر تو ایسے ہوں جنہیں ایک عام قاری سمجھ سکے۔

غالب کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن

اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ دراصل داغ دہلوی کی غزل ہے۔ خاص کر اس غزل کا مقطع تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں داغ کا ہوں غالب کا نہیں ؎

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

داغ کا ایک اور شعر جو خواہ مخواہ دیوانِ غالب میں در آیا ہے یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اور اس شعر کا خالق تو میر تقی میر کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دیوانِ غالب میں کتابت کی غلطیوں کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر بالغ نے چند حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں۔ ان کی رائے میں غالب کے کئی اشعار محض کاتب

کی غفلت شعاری سے نشتر کی بجائے شعر بن کے رہ گئے ہیں۔ بالآخر صاحب نے مشتے از خروارے کے مصداق پانچ اشعار منتخب کئے ہیں۔ جو اگر صحیح صورت میں لکھے جاتے تو بیت الغزل کہلاتے سے

(شعرِ غالب) کوئی صورت نظر نہیں آتی
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

(کاتب) کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

(شعرِ غالب) دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
جاتا وگر نہ ایک دن اپنی خبر کو ہیں

(کاتب) دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

(شعرِ غالب) اسدِ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

(کاتب) اسدِ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

(شعرِ غالب) لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

(کاتب) لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

(شعرِ غالب) اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

(کاتب) اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ڈاکٹر بالغ کی ریسرچ میں ایک مقام ایسا بھی آیا ہے جہاں تحقیق تحقیق نہیں رہی، الہام بن گئی ہے۔ سالہا سال کی دماغ سوزی کے بعد انھوں نے اس ستم پیشہ ڈومنی کا نام ڈھونڈ نکالا ہے جس پر غالب مرتے تھے اور جسے انھوں نے عمر بھر کے لئے مار رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی دانست میں اس کا نام ناز تھا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے غالب کے چند اشعار پیش کئے ہیں ؎

میں نے کہا کہ بزمِ "ناز" چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(نوٹ) غالب نے نثر میں اپنی محبوبہ کو ستم پیشہ کا لقب دیا تھا۔ اِس شعر میں اُسے "ستم ظریف" کہہ کر یاد کیا ہے۔

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمایئے ؎

ہماری سادگی تھی التفاتِ "ناز" پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

اک نوبہارِ "ناز" کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

دشنۂ غمزہ جاں ستاں۔ ناوکِ "ناز" بے پناہ

وہ نشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے
نگاہِ "ناز" کو پھر کیوں نہ آشنا کہیئے

ڈاکٹر باآنغ کے خیال میں جس محبوبہ کی وفات پر مرزا نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا تھا وہ "ناز" ہی تھی۔ جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

گلفشانی ہائے "نازِ" جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

آپ نے ڈاکٹر باآنغ کے تمہیدی مقالہ سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فنِ تحقیق میں اُن کا کیا مقام ہے۔ اب بھی اگر مرزا غالب یہ شکایت کریں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا تو چاہے آپ غالب کے طرفدار ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب ڈاکٹر باآنغ کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں! ان کا شکوہ نہ صرف بے جا ہے بلکہ بے بنیاد بھی ہے!!

قہوہ خانے میں

کردار

کملا دیوی .... ایک جدید شاعرہ
نپنگل .... ایک جدید شاعر
گوپال .... ایک بیوپاری
سریش .... ایک طنز نگار

نپنگل ۔ بیرا!
بیرا ۔ حضور!
نپنگل ۔ چار ہاف کافی۔
کملا ۔ (بیرے سے) تین ہاٹ ۔ ایک کولڈ۔
نپنگل (بیرے سے) دو ہاٹ ۔ دو کولڈ۔
سریش ۔ نپنگل صاحب آپ بھی کولڈ پئیں گے کیا؟
نپنگل ۔ جی ہاں کیونکہ کملا دیوی کولڈ پئیں گی۔
سریش ۔ آپ ہر بات میں کملا دیوی کی پیروی کیوں کرتے ہیں؟
نپنگل ۔ سریش صاحب ۔ کملا دیوی دانشوروں کی امام ہیں ۔ آپ نے شاید ان کا تازہ مرثیہ نہیں پڑھا۔

گوپال - مرثیہ! تو گویا آج کل یہ مرثیے لکھ رہی ہیں کوئی تازہ چوٹ لگی ہے شاید!
کجلا - نہیں یہ بات نہیں - میں نے ایک خرگوش پر مرثیہ لکھا ہے۔
گوپال - خرگوش پر؟ موضوع تو برا نہیں۔
سریش - (کجلا دیوی سے) آپ نے خرگوش کے لمبے لمبے کانوں کی خوب تعریف کی ہو گی۔
گوپال - گدھے کے علاوہ خرگوش کے کان بہت لمبے ہوتے ہیں۔
سریش - (پنگل کے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آپ پنگل صاحب کو کیوں بھول رہے ہیں۔
پنگل - (سریش کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے) میں نے کجلا دیوی کا مرثیہ پڑھا۔ مجھے بے اختیار خرگوش پر رشک آیا۔
گوپال - حالانکہ ترس آنا چاہیئے تھا۔
سریش - یعنی آپ کا جی چاہنے لگا کاش میں انسان کی بجائے خرگوش ہوتا۔
پنگل - جی ہاں کجلا دیوی کی طرح میں تمام جانوروں سے محبت کرتا ہوں۔
سریش - اور تمام انسانوں سے نفرت۔
کجلا - انسان تو روزِ ازل سے قابلِ نفرت رہا ہے۔
گوپال - آپ اور پنگل صاحب اپنے اپنے دماغ کا نفسیاتی تجزیہ کرائیے - آخر آپ ہمیشہ چوہوں، بلیوں اور مرغیوں پر نظمیں کیوں لکھتے ہیں؟
کجلا - یہ بات نہیں میں نے کیڑوں مکوڑوں پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔
سریش - یک شد نہ دو شد!
پنگل - سریش صاحب - آپ کو کجلا دیوی کی "تیتر" پر لکھی نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو گا۔

سرَیش - جی ابھی تک تو نہیں ہوا۔ ویسے میں تیتر پر نظم پڑھنے کی بجائے اس کا شکار
کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

کجلا - آپ ایک دم جانور ہیں۔

سریش - پھر تو آپ مجھ سے محبت کر سکتی ہیں۔

(بیرا کافی لاتا ہے)

کجلا - کافی دیکھ کر مجھے حبشیوں کی وہ ملکہ یاد آجاتی ہے جو ہر رات سونے سے
پہلے گایا کرتی تھی۔
"اے چمگادڑ تو کتنی اداس ہے"

پنگل - اور مجھے خوابوں کے وہ جزیرے یاد آتے ہیں جن پر انسانوں کی بجائے لنگور
رہتے ہیں۔

سریش - اور مجھے خیال آتا ہے تم دونوں پاگل ہو گئے ہو یا بہت جلد ہو جاؤ گے۔

کجلا - آپ سو فیصد گھامڑ ہیں۔

پنگل - کافی کا مزا اس کے کڑوے پن میں ہے۔

کجلا - (سرد آہ بھر کر) زندگی کتنی کڑوی ہے۔ کریلے کی طرح!

پنگل - سبحان اللہ! کتنی نادر تشبیہ ہے!

کجلا - کریلے سے میرا دھیان "اکیلے" کی طرف چلا گیا۔ آہ! ہم سب کتنے اکیلے ہیں۔
اکیلے اور اداس۔ جیسے کسی بیابان میں کیکر کے درخت پر بیٹھا اُلّو خون کے
آنسو بہا رہا ہو۔

پنگل - بہت خوب۔ آپ کے تخیل کا جواب نہیں۔

سریش - کجلا جی۔ آپ شاید نہیں جانتیں اُلّو کو بیابان کتنا اچھا لگتا ہے۔ بھلا وہ
خون کے آنسو کیوں بہائے گا۔

کملا۔ کیا آپ کا مطلب ہے اُلّو کبھی جذباتی نہیں ہو سکتا۔ میں نے ایک اُلّو کو دہاڑیں
مار کر روتے دیکھا ہے۔

گوپال۔ اُلّو کو نہیں پنگل جی کو دیکھا ہو گا۔

کملا۔ (چمک کر) واہ! کیا میں پنگل جی اور اُلّو میں تمیز نہیں کر سکتی۔

سریش۔ آپ کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

پنگل۔ اجی چھوڑیئے۔ کملا جی ڈیزی کا کیا حال ہے؟

گوپال۔ یہ ڈیزی دیوی کون ہیں؟

کملا۔ ڈیزی میری ایرانی بلّی کا نام ہے۔

گوپال۔ ہم سمجھے آپ کی کوئی بڑی پیاری سہیلی ہے۔

کملا۔ اس میں کیا شک ہے۔ ڈیزی میری عزیز ترین سہیلی ہے۔

پنگل۔ سریش صاحب۔ اگر آپ بلّی پالتے تو اس کا کیا نام رکھتے؟

سریش۔ میرا دماغ چل گیا ہے کیا۔ میں بلّی پالتا ہی کیوں جو اس کا نام رکھنے کی ضرورت
پڑتی۔

کملا۔ آپ بالکل خشک آدمی ہیں۔ آپ کو تو خشک پھلوں کا بیوپاری ہونا
چاہیئے تھا۔

پنگل۔ خشک پھلوں میں خوبانی کی کیا بات ہے۔ اس نام میں کتنی شاعری ہے۔

سریش۔ لو اور سنو! خوبانی کی گٹھلی تو سنی تھی۔ آج پتہ چلا اس میں شاعری بھی
ہوتی ہے۔

گوپال۔ اچھا ہمیں تو اجازت دیجیئے۔ شریمتی جی انتظار کر رہی ہوں گی۔

پنگل۔ ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔

گوپال۔ معاف کیجیئے۔ میں اپنی بیوی سے ذرا ڈرتا ہوں۔

کملا۔ میں ان شوہروں سے نفرت کرتی ہوں جو زن مرید ہوتے ہیں۔
گوپال۔ اس کا مطلب تو ہوا آپ سب شوہروں سے نفرت کرتی ہیں۔ اچھا ادب عرض!
نیگل۔ کملاجی اس ناٹک کا کیا بنا جو آپ "جنتر منتر تھیٹر" کے لئے لکھ رہی تھیں۔
کملا۔ وہ تو کبھی کا لکھا جا چکا۔
ستیش۔ کیا اس میں بھی آپ کے پہلے ناٹک کی طرح یاسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔
کملا۔ یاسیت ایک ٹھوس حقیقت ہے ستیش صاحب۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ مسرت تو ایک سانحہ ہے۔ ایک کبھی ہاتھ نہ آنے والا لمحہ۔ آپ نے فراق کا وہ شعر سنا ہوگا :۔ ؎

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

ستیش۔ لیکن سوال یہ ہے آپ ہر وقت اداس کیوں رہتے ہیں۔؟
نیگل۔ یہ سب اس دور کا قصور ہے جس میں ہم پیدا ہوئے ہیں۔ اس دور میں جو شخص مسکراتا ہے وہ نیم پاگل ہے اور جو قہقہہ لگاتا ہے وہ سو فیصدی پاگل۔
ستیش۔ آپ کے خیال میں سب سے بڑا دانشور وہ ہے جو مالیخولیا کے مرض میں مبتلا ہے۔
کملا۔ مالیخولیا! کتنا خوبصورت لفظ ہے۔ آنسو کی طرح۔ میں کبھی سوچتی ہوں یہ دنیا کتنی حسین ہوتی اگر ہم سب دن رات آنسو بہایا کرتے۔
ستیش۔ حسین تو خاک ہوتی البتہ ماتم کدہ بن جاتی۔
کملا۔ کیا آپ کے نزدیک اب یہ ماتم کدہ نہیں ہے۔ یقیناً آپ شدید قسم کی

خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ اگر آپ کے پاس سوچنے والا دماغ ہوتا تو آپ ہرگز یہ نہ کہتے۔

سربلش۔ سوچنے والا دماغ تو صرف آپ ایسے دانشوروں کے ہی پاس ہے۔

کھبلا۔ دراصل آپ کا بھی قصور نہیں۔ آپ کو اس مقدار میں افیون کھلائی جا رہی ہے کہ آپ کا دماغ بے کار ہو گیا ہے۔

سربلش۔ افیون؟ کون سی افیون؟

نیگل۔ سربلش صاحب۔ مذہب۔ اخلاق۔ سائنس۔ سیاست۔ تعلیم یہ سب افیون ہی تو ہیں۔

سربلش۔ اور سب سے خطرناک افیون وہ فلسفہ ہے جس میں آپ اعتقاد رکھتے ہیں۔

کھبلا۔ ہمارا فلسفہ نہایت خوشگوار اور جاندار فلسفہ ہے۔

سربلش۔ (طنزاً) تبھی تو وہ آپ کو خودکشی کی طرف لے جا رہا ہے۔

کھبلا۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ جب زندگی ہی بے معنی ہو تو زندہ رہنے کا فائدہ؟

سربلش۔ اگر آپ دونوں خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

نیگل۔ لیکن ہم ابھی خودکشی نہیں کریں گے۔ ہمیں ایسے فلسفے کی تبلیغ کرنا ہے۔

سربلش۔ آپ انفرادی خودکشی میں نہیں اجتماعی خودکشی میں یقین رکھتے ہیں۔

کھبلا۔ چھوڑیئے۔ آپ کیا قصہ لے بیٹھے۔ بات تو میرے ناٹک کی ہو رہی تھی۔

نیگل۔ کھبلا جی۔ یہ ناٹک کب کھیلا جا رہا ہے۔

کھبلا۔ مجھے افسوس ہے یہ ناٹک کبھی نہیں کھیلا جائے گا۔

نیگل۔ (چونک کر) خیر تو ہے؟

کجلا۔ اس کے لئے نہ مناسب ہیرو مل رہا ہے نہ ہیروئن۔
سرلیش۔ ایسی کیا بات ہے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔
کجلا۔ بات دراصل یہ ہے میرے ناٹک کی ہیروئن ایک خوبصورت لوم‌ڑی ہے۔
سرلیش۔ اکثر ہمارے ناٹکوں کی ہیروئن ایسی ہی ہوتی ہے۔
کجلا۔ لیکن وہ ایک بندر سے محبت کرتی ہے۔
سرلیش۔ تو کیا حرج ہے۔ ہمارے ناٹکوں میں ہیروئن جس سے محبت کرتی ہے اس میں اور ایک بندر میں فرق ہی کتنا ہوتا ہے۔
کجلا۔ آپ تو محض بکواس کر رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کوئی ہیروئن ہی ڈھونڈ دیں۔
سرلیش۔ اچھا سوچ کر بتاتا ہوں۔
کجلا۔ آپ سوچئے۔ میں ذرا میک اپ ٹھیک کرلوں (میک اپ ٹھیک کرتی ہے۔)
سرلیش۔ (کجلا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے) بخدا۔ میک اپ کے بعد آپ ہوبہو اپنے ناٹک کی ہیروئن نظر آتی ہیں۔
کجلا۔ آپ کی عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی۔؟
سرلیش۔ یقین نہ آئے تو پنگل جی سے پوچھ لیجئے۔
کجلا۔ کیوں پنگل جی کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟
پنگل۔ ٹھیک نہیں تو اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہے۔
کجلا۔ چلئے ایک مشکل تو حل ہوئی۔
سرلیش۔ اور دوسری مشکل کا حل یہ ہے کہ پنگل جی میک اپ کے بغیر ہیرو کے پارٹ کے لئے موزوں ترین شخص ثابت ہوں گے۔
کجلا۔ پنگل جی آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ کیا آپ ہیرو کا پارٹ کرنے

پر رضامند ہیں۔؟

تیگل۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

سر نیش۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ اب یہ سرکس ضرور ہوگا۔

کجا۔ سرکس نہیں ناٹک۔

سریش۔ آپ اسے ناٹک کہہ لیجئے، لیکن غیر دانشور تو اس کھیل کو جس میں جانور کام کریں سرکس ہی کہیں گے۔

کجلا۔ غیر دانشوروں پر خدا کی لعنت۔!

سریش۔ آمین۔ ثم آمین۔!!!

شیخ سلّی

شیخ سلّی کہ جو شیخ چلّی کے پڑپوتے کہلاتے تھے۔ دور کی کوڑی لانے میں یکتائے روزگار تھے۔ ایک دن بیگم سے کہنے لگے "پلان بناؤ ورنہ تباہ ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" بیگم سمجھیں شیخ صاحب فیملی پلاننگ کا ذکر کر رہے ہیں۔ ہوا میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں شرم نہیں آتی۔ اس عمر میں فیملی پلاننگ کا ذکر کرتے ہوئے۔ گیارہ بچے پیدا کرنے کے بعد جب طبیعت اُوب گئی تو توبہ کی سوجھی۔"

شیخ صاحب نے بیگم کی ناسمجھی پر سر پیٹنے کے بعد جواب دیا۔ "ہمیں آج تک پتہ نہ چلا کہ خدا نے کس مصلحت کی بنا پر تمہیں عقل سے محروم رکھا۔ ہم فیملی پلاننگ کا نہیں سات سالہ پلان کا ذکر کر رہے ہیں۔ اولاد کے متعلق ہمارا جو نظریہ ہے اس سے ساری دنیا بخوبی واقف ہے۔ دراصل غالب کا جو عقیدہ آموں کے بارے میں تھا، ہمارا وہی بچوں کے بارے میں ہے۔ یعنی زیادہ ہوں اور میٹھے ہوں۔ میٹھے یعنی "سویٹ" ہم بچوں کی تعداد سے کبھی نہیں گھبرائے۔ اگر ایک بچہ بھی لائق ثابت ہو تو ننانوے نالائق بچوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔"

"پھر یہ سات سالہ پلان کیا ہے؟"

"توبہ! توبہ! بدمذاقی کی حد ہو گئی۔ تم پلان کو بلا سمجھتی ہو۔ یہی وجہ ہے ہمارے یہاں زبوں حالی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ تم نے شاید وہ شعر نہیں سنا۔

"یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا"

ہم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بیگم نے شیخ صاحب کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ "کون سے یارانِ تیز گام؟" شیخ صاحب نے جھلا کر کہا "لاحول وللہ۔ عجیب نامعقول عورت ہو۔ نہ بیہودہ سوال کرتی ہو۔ ارے بھئی انہوں نے جنہیں خداوند کریم نے توفیق دی کہ سات سالہ پلان بنائیں۔

"اس سے انہیں کیا فائدہ ہوا؟"

"اُن کے وارے نیارے ہوگئے۔ ان دنوں وہ کروڑپتی کہلاتے ہیں۔ شاندار کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ پُرتکلف کاروں میں گھومتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ کبھی ہم سے بھی زیادہ مفلس اور قلاّش تھے۔"

"اگر یہ بات ہے تو آپ بھی اللہ کا نام لے کر سات سالہ پلان بنا ڈالئے۔ شاید اُس سے ہی ہمارے دن پھریں۔"

"ابھی بناتے ہیں۔ تم ہمّت کر کے ایک کاغذ اور قلم لے آؤ۔"

کاغذ کو میز پر رکھتے ہوئے شیخ صاحب نے بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اچھا پہلے اس پلان کا ذرا خاکہ سن لو۔"

"فرمائیے۔"

"ہم اپنے گیارہ بچوں کو ولایت بھیجیں گے۔"

"کرکٹ ٹیسٹ میچ میں حصّہ لینے کے لئے۔"

"تم بھی اُلٹی کھوپڑی کی ہو۔ کرکٹ ٹیسٹ میچ میں حصّہ لینے کے لئے نہیں آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔"

"اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔ ہم اپنی زمین بیچ دیں گے۔ پھر بھی کام نہ بنا تو گھر کا اسباب فروخت کر دیں گے۔"

"یہ مسئلہ تو حل ہوا آگے چلیئے۔"

"ہم اپنا بوسیدہ مکان مسمار کر دیں گے۔ اس کے بجائے عالی شان کوٹھی تعمیر کریں گے۔"

"کوٹھی کے لئے ......"

"روپیہ کہاں سے آئے گا۔ تم یہی بات کہنا چاہتی ہو نا۔ کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ دے ہی دے گا۔ آخر ہندوستان میں پچپن کروڑ انسان رہتے ہیں۔ یہ سب تو بخیل ہو نہیں سکتے۔ بالفرض ہمیں کسی نے روپیہ نہ دیا۔ ہم غیر ممالک میں رہنے والوں سے اپیل کریں گے کہ اس کارِ خیر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ بہر حال مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔"

"کوٹھی بھی بن گئی۔ اب اور کیا بنانے کا ارادہ ہے؟"

"اس کے بعد ہم ایک ڈی لکس کار خریدیں گے۔ یہ ماہانہ قسطوں پر خریدی جائے گی جنہیں ہمارا کوئی نہ کوئی دوست ادا کرے گا۔"

"فرض کیجئے ہمارا کوئی دوست قسطیں ادا کرنے پر رضامند نہیں ہوتا پھر؟"

"تم ایسی فضول بات فرض ہی کیوں کرتی ہو۔ یہ کیوں نہیں فرض کرتیں کہ ہمارے اتنے دوست رضامند ہو جائیں گے کہ ہمیں ہر ماہ بذریعہ قرعہ اندازی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ان میں سے کون قسط ادا کرے گا۔ بصورتِ دیگر ہم اسی ہزار روپیہ قرض لے لیں گے۔"

"کار لینے کے بعد ہمارا اگلا پروگرام کیا ہوگا؟"

"اگلا پروگرام پیداوار بڑھانا ہوگا - تم شاید پوچھنا چاہو گی زمین بیچنے کے بعد ہم فصلیں کہاں اگائیں گے - اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب ہے اپنی کوٹھی کے آنگن میں اور کوٹھی کی چھت پر۔"

"کوٹھی کی چھت پر آپ ہل چلائیں گے کیا؟"

"ہل نہیں ٹریکٹر۔"

"پھر تو چھت کا خدا حافظ ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں ہم ٹریکٹر ذرا آہستہ چلائیں گے۔"

"لیکن چھت پر جگہ ہی کتنی ہوگی؟"

"اس کا وہم نہ کرو - ہم جدید کھاد استعمال کر کے تھوڑی زمین میں زیادہ پیداوار حاصل کر لیں گے - تین سال کے بعد ہمیں فصل سے اتنی آمدنی ہو جائے گی کہ ہم اپنا سارا قرض ادا کر سکیں گے - اس کے بعد آنے والے چار برسوں میں ہماری خوشحالی کا وہ ٹھکانہ ہوگا کہ لوگ ہم پر رشک کیا کریں گے۔"

"تو یہ ہے آپ کی سات سالہ پلان کا مکمل خاکہ۔"

"ابھی مکمل کہاں ہے ہم نے تمہیں یہ تو بتایا نہیں کہ کوٹھی کے دو کمروں میں پولٹری فارم کھولا جائے گا - پانچ سو مرغیاں پالی جائیں گی - ہر ایک مرغی اوسطاً دس انڈے دے گی - اس طرح ہمارے پاس پانچ ہزار چوزے ہو جائیں گے - ہر ایک چوزہ......"

"آپ تو اپنے پڑدادا شیخ چلّی کی طرح ہوائی قلعے بنانے لگے۔"

"پڑدادا جان تو بڑے سادہ لوح تھے - اگر کوئی باقاعدہ پلان بناتے تو آج ہمارے خاندان کی حالت اتنی پتلی نہ ہوتی - ہاں تو ہم کہہ رہے تھے ایک چوزہ دو روپے میں فروخت کیا جائے گا - اب ہمارے پاس دس ہزار روپیہ

ہوجائے گا۔"

"اس سے شاید آپ بھیڑیں خریدیں گے ؟"

"ہاں۔ اور بھیڑوں کی اون فروخت کرکے جو روپیہ آئے گا اس سے ہم ایک نئی قسم کا کارخانہ لگائیں گے۔"

"یہ کارخانہ کون سا مال تیار کرے گا۔؟"

"یہ کارخانہ چھوٹے چھوٹے کارخانے تیار کرے گا۔ جیسے سمینٹ تیار کرنے کا کارخانہ۔ بلیڈ بنانے کا کارخانہ۔ کھانڈ بنانے کا کارخانہ۔ موٹریں بنانے کا کارخانہ وغیرہ وغیرہ۔ آئندہ جس شخص کو کارخانہ لگانا مقصود ہوگا وہ ہمارے کارخانے سے بنا بنایا کارخانہ آ کر لے جایا کرے گا۔"

"تب تو ہم کروڑ پتی ہوجائیں گے۔؟"

"اس میں کیا شک ہے؟"

"اس پلان کو عملی جامہ کب پہنایا جائے گا؟"

شیخ صاحب نے یک لخت ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ "عملی جامہ، بیگم کیا تم واقعی سمجھتی ہو۔ پلانوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ تم بڑی سادہ لوح ہو۔ ہم شیخ چلی کے پڑپوتے سہی، لیکن اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں پلان صرف کاغذ پر بنائے جاتے ہیں۔ جانتی ہو اگر ہم اس پلان پر عمل کریں گے۔ ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ہمیں زمین اونے پونے فروخت کرنی پڑے گی۔ کوئی شخص ہمیں قرض دینے پر آمادہ نہ ہوگا۔ ہمارا کوٹھی بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اگر ہم اپنا بوسیدہ مکان گرا دیں گے ہمیں فٹ پاتھ پر بسیرا کرنا پڑے گا۔ ہمارے بچے فیس ادا نہ کر سکیں گے اور انھیں آکسفورڈ سے نکال دیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائیگی۔"

"اگر یہ معاملہ ہے تو اتنی لاف زنی کی کیا ضرورت تھی؟"

"بیگم دہلی میں ایک بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

"پھر بھی اسے عملی جامہ پہنانے میں حرج کیا ہے؟"

"ضرور جاننا چاہتی ہو؟"

"ہاں!"

"حرج صرف اتنا ہے جب ہمارا سات سالہ پلان فیل ہو جائے گا تو ہم دونوں کو یہ نعرہ لگانا پڑے گا:۔

"پلان بناؤ اور تباہ ہو جاؤ"

ہم نے اپنا بھارتیہ کرن کیا!

ہم نے سوچا اس سے پہلے کہ کوئی شخص ہمارا بھارتیہ کرن کرے کیوں نہ ہم ہمت سے کام لے کر اپنا بھارتیہ کرن کر ڈالیں۔ سب سے پہلا مسئلہ ہمارے نام کا تھا جیسا کہ آپ شاید نہیں جانتے ہمارا نام اقبال چند ہے۔ ہمیں خیال آیا 'اقبال' عربی کا لفظ ہے۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے عربی نام رکھنا کہاں کی حب الوطنی ہے۔ ہم نے اپنا نام 'کنگال چند' رکھ لیا۔ یہ نام ویسے بھی ہماری مالی حالت کی غمازی کرتا تھا۔ نہ صرف ہماری بلکہ ملک کی حالت کی بھی!

دوسرا مسئلہ لباس کا تھا۔ پتلون، کوٹ اور ٹائی میں کہیں ہندوستانیت نظر نہ آئی۔ یہ تینوں چیزیں ہماری غلامانہ ذہنیت کی نمائندگی کرتی تھیں۔ بے حد تعجب ہوا ہم آج تک اُنہیں کیسے پہنتے رہے؟ سوچا پتلون کی بجائے پاجامہ پہنا کریں گے، لیکن کسی فارسی داں نے بتایا۔ 'پاجامہ' لفظ بھی ایران سے ہندوستان میں آیا ہے۔ ہم دھوتی اور کرتہ پہننے لگے۔ قمیص اس لئے نہیں کہ قمیص عربی کا لفظ ہے اور اس میں عرب کی بُو باس بسی ہوئی ہے۔

تیسرا مسئلہ بالوں کا تھا۔ انگریزی ڈھنگ سے بال رکھنا ملک سے غداری نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم نے نائی سے کہا ہمارے سر کے درمیان ایک لمبی چوٹی رکھنے کے بعد سارے بال کاٹ دو۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ قدیم ہندوستانیوں

کی تصاویر میں ہم نے دیکھا تھا وہ بڑی گھنی اور لمبی مونچھیں رکھا کرتے تھے۔ اُن کی پیروی کرتے ہوئے ہم مونچھیں بڑھانے لگے۔ ہمارے چھوٹے سے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر ہمارے احباب سمجھے ہم نے کسی ناٹک میں کام کرنے کے لئے بناوٹی مونچھیں لگائی ہیں۔ احباب کی بات چھوڑیئے۔ جب ہم اپنے کو اس نئے روپ میں دیکھتے، یوں محسوس ہوتا، ہمیں خدا نے نہیں شنکر کارٹونسٹ نے بنایا ہے، لیکن ہم ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ ہندوستانی بننے کے لئے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا۔

اب آپ ہماری عینک ہی کو لیجئے۔ ہم نے کئی پنڈتوں سے پوچھا۔ کیا رامائن اور مہابھارت میں کہیں عینک کا ذکر بھی آیا ہے؟ انہوں نے کہا۔ "اُس دور میں لوگ وناسپتی گھی کہاں کھاتے تھے جو اُن کی بینائی جوانی ہی میں کمزور ہو جاتی"۔ ہم نے سوال کیا۔ کیا سُگریو، کنبھ کرن، دوشاسن سب کی بینائی اتنی تیز تھی کہ انھیں کبھی عینک لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی؟ کہنے لگے وہ سب کاجل لگایا کرتے تھے۔ ہمیں اپنے مسئلے کا حل مل گیا۔ عینک اتار دی اور کاجل استعمال کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت رسّی پر سانپ اور بکرے پر کتّے کا دھوکہ ہونے لگا۔ نیز جب کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتے تو کالا اکھر بھینس برابر والا معاملہ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد ہمیں رات کے علاوہ دن میں بھی ہر چیز پر کسی دوسری چیز کا دھوکہ ہونے لگا۔ آنکھوں کے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا اُس نے سمجھایا۔ اگر آپ اندھے نہیں ہونا چاہتے تو فوراً عینک لگا لیجئے۔

"لیکن یہ ہندوستانی نہیں ہے"۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ گھڑی جو آپ نے کلائی پر باندھ رکھی ہے، ہندوستانی نہیں اور یہ سگریٹ جو آپ پی رہے ہیں، یہ بھی ہندوستانی

کہاں ہے۔"

"آپ نے بہت اچھے وقت یاد دلایا۔ کل سے ہم حقّہ پیا کریں گے۔"

"اور گھڑی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"گھڑی اتار دیں گے۔"

"اور وقت معلوم کرنا ہوا تو؟"

"کسی سے پوچھ لیا کریں گے۔"

"خیر جو چاہے کیجئے، لیکن عینک ضرور لگا لیجئے نہیں تو آنکھیں نہ رہیں گی۔"

یہ سوچتے ہوئے اگر ہم اندھے ہو گئے تو ہندوستان میں اندھوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ہم نے عینک لگالی۔

ایک رات جب ہم ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے اعتراض کیا۔ ٹیلی ویژن ہندوستانی نہیں۔ ہم نے اس کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔ "اگر زمانۂ قدیم میں ٹیلی ویژن نہ ہوتا تو سنجے مہاراج دھرت راشٹر کو مہابھارت کا آنکھوں دیکھا حال کس طرح سنا سکتے تھے؟"

"وہ تو یوگ کا معجزہ تھا۔"

"آپ اسے یوگ کا معجزہ کہہ لیجئے۔ ہم تو سمجھتے ہیں سنجے کے پاس ٹیلی ویژن سیٹ تھا۔"

"سنجے کی وفات کے بعد وہ سیٹ کہاں گیا؟"

"مہابھارت کی جنگ میں تباہ ہو گیا۔"

کچھ اور دنوں کے بعد ہمارے ایک دوست نے ہم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنا بھارتیہ کرن تو کر لیا، لیکن آپ بوٹ کیوں پہنتے ہیں؟"

"کل سے جوتا پہنا کریں گے۔"

جوتا پہن کر چلنے میں کافی تکلیف کا احساس ہوا کیونکہ وہ پاؤں کو بری طرح کاٹتا تھا۔ ہم نے اس کی بھی پرواہ نہ کی لیکن باتیں بنانے والے کب چپ رہ سکتے تھے کہنے لگے "آپ بس یا ٹیکسی میں دفتر کیوں جاتے ہیں۔ رتھ یا پالکی میں جایا کیجئے۔" ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ "بیسویں صدی میں رتھ اور پالکیاں ہیں کہاں جن میں سوار ہوا جا سکے۔؟"

"تو پھر پیدل جایا کیجئے۔"

"دفتر آٹھ میل پر ہے۔ پیدل کس طرح جا سکتے ہیں؟"

"تو پھر بھارتیہ کرن کا خبط چھوڑ دیجئے۔"

"وہ ہم نہیں چھوڑ سکتے۔"

وہ پھبتی کستے ہوئے بولا۔ "آپ کی شریمتی جی تو ابھی تک لپ اسٹک اور پوڈر لگاتی ہیں اُن کا بھارتیہ کرن کب ہوگا۔؟"

بات تلخ ضرور تھی، لیکن سچی تھی۔ ہم نے وعدہ کیا کہ شریمتی جی سے اصرار کرینگے۔ آئندہ پان سے اپنے ہونٹ رنگا کریں اور پاؤڈر کی بجائے چندن کا لیپ کیا کریں۔

ہم نے سمجھا تھا کہ اب کوئی نکتہ چیں ہم پر الزام نہ لگائے گا کہ ہم سو فیصد ہندوستانی نہیں ہیں، لیکن ہمارا خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک شام کچھ نوجوان ہمیں مبارکباد دینے کے بہانے گھر پر آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے پوچھا۔ "مکمل ہندوستانی ہونے کے باوجود آپ نے ٹیلی فون کیوں لگا رکھا ہے؟"

"ٹیلی فون تو زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔"

"لیکن اس کی ایجاد ہندوستان میں نہیں ہوئی۔"

"یوں تو بجلی کی ایجاد بھی ہندوستان میں نہیں ہوئی۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ پھر بجلی کے بلبوں کی بجائے چراغ جلایا کیجئے۔"
"چراغوں سے اتنی روشنی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟"
"آپ نے گھر میں کرسیاں کیوں رکھی ہوئی ہیں؟"
"بیٹھنے کے لئے۔"
"قدیم ہندوستانی کرسیوں پر نہیں بیٹھتے تھے۔"
"اور کس چیز پر بیٹھتے تھے؟"
"فرش پر۔"
دو ایک منٹ کے سکوت کے بعد ایک نوجوان نے کہا "آپ چائے کیوں پیتے ہیں؟"
"اور کیا پیا کریں؟"
"جوشاندہ۔"
"جوشاندہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے؟"
"پھر دودھ پیا کیجئے۔"
"دودھ ہضم نہیں ہوتا پھر مہنگا بھی ہے۔"
"آپ کے لڑکے میڈیکل کالج میں کیوں پڑھتے ہیں؟"
"ہم انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔"
"ڈاکٹر کیوں، وید کیوں نہیں؟"
"ہمارا آیورویدک سسٹم میں اعتقاد نہیں ہے۔"
"وہ تو خالص ہندوستانی سسٹم ہے۔"
"ہوگا۔ ہمیں پسند نہیں۔"
"باقی ہندوستانی چیزیں پسند ہیں، یہ کیوں نہیں؟"

"اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ سو فی صدی ہندوستانی نہیں۔"

وہ چلے گئے، لیکن ہم عجیب دُبدھا میں پڑ گئے۔ کیا اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی ہم اپنا مکمل بھارتیہ کرن نہیں کر سکے؟ کیا واقعی چراغ جلانا ہوں گے؟ جوشاندہ پینا پڑے گا؟ لڑکوں کو گورو کل بھیجنا ہوگا؟ اور یہ سب کچھ کر لیا تو نکتہ چیں کہیں گے —— آپ انگریزی اخبار کیوں پڑھتے ہیں؟ پینسلین کے ٹیکے کیوں لگواتے ہیں؟ کیک اور بسکٹ کیوں کھاتے ہیں، شریمتی جی کو ڈارلنگ کیوں کہتے ہیں؟

بہت دیر تک سوچنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا، اخبارات میں اعلان کر دیں۔ جہاں تک ممکن تھا، ہم نے اپنا بھارتیہ کرن کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ بھارتیہ کرن کرنے کی ہم میں توفیق نہیں۔!

غربت کا خاتمہ

"محکمہ انسدادِ غربت" کے ڈائرکٹر جناب شاطر حسین شاطر بڑے ستم ظریف واقع ہوئے ہیں۔ سائل کو ایسا کرارا جواب دیتے ہیں کہ وہ بے چارا بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اکثر بہت فخر سے فرمایا کرتے ہیں "عوام غریب ہیں تو ہم عجیب و غریب ہیں!" چند دن ہوئے انہوں نے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا، جہاں مقتدر اخبارات اور رسائل کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"حکومت تہیہ کر چکی ہے کہ غربت کو ختم کر کے ہی دم لے گی۔ غربت ایک لعنت ہے اور جو حکومت اسے برداشت کرتی ہے وہ اس سے بھی بڑی لعنت ہے۔ حکومت جانتی ہے اگر اس نے غربت کو ختم نہ کیا غربت اسے ختم کر دے گی۔" محکمۂ انسدادِ غربت" اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ عوام کو غربت سے نجات دلائی جائے۔ غربت ہمارے سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ جسے بد قسمتی سے ہم جھومر سمجھتے رہے ہیں۔ اگر غربت ختم کر دی جائے تو اس کے ساتھ کمیونزم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

اس مختصر سی تمہید کے بعد اُنھوں نے نمائندوں کو سوالات پُوچھنے کی دعوت دی۔

"آپ کے خیال میں غربت کو ختم کرنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا؟"

"کم از کم تین سو سال۔"

"اس عرصہ میں غربا کی کتنی ہی نسلیں راہیِ مُلکِ عدم ہو جائیں گی۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں اور شاید بوقتِ مرگ اُن کی زبان پر میرؔ کا یہ شعر ہو گا ؎

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عُمر نے ہم سے بے وفائی کی"

"حکومت کو غربت ختم کرنے کے لئے اتنے لمبے عرصے کی کیوں ضرورت ہے؟"

"غربت ایک دیرینہ مرض ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارا ملک پچھلے تین ہزار برس سے اس میں مبتلا ہے اور کسی مسیحا کا انتظار کرتا رہا ہے۔ روایتی معالجوں نے جب کبھی اس کا علاج کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے صرف ایک مصرع پڑھ کر اُن کا حوصلہ پست کر دیا ؏

تم اچھا کر نہیں سکتے، میں اچھا ہو نہیں سکتا!"

"حکومت غربت کو ختم کرنے کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے؟"

"حکومت نے ہر وزیر کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی ہر تقریر میں غربت کو جلد از جلد ختم کرنے کا وعدہ کرے۔ چاہے عوام اُس کی تقریر سننے کے بعد سراج لکھنوی کا یہ شعر پڑھنے پر کیوں نہ مجبور ہو جائیں ؎

وہی لہجہ، وہی تیور، قسم ہے تیرے وعدوں کی
ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ جھوٹی تسلّی ہے!

اس کے علاوہ حکومت مستقبل قریب میں موم بتیاں بنانے کی صنعت اور اگربتیاں فروخت کرنے کی تجارت کو نیشنلائز کر رہی ہے۔"

"اس سے غرباء کو کیا حاصل ہوگا؟"

"روشنی اور خوشبو!"

"اس وقت امارت اور غربت میں جو خلیج حائل ہے اُسے پاٹنے کے لئے حکومت کیا کر رہی ہے؟"

"فی الحال حکومت نے مے نوشی پرسی لنگ' (Ceiling on Booze) لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پندرہ اگست کے بعد کوئی شخص کسی محفل میں غیر ملکی وہسکی کے دس اور ہندوستانی وہسکی کے پندرہ پیگ سے زیادہ نہ پی سکے گا۔ اس طرح جو شراب بچ رہے گی اسے غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔"

"لیکن غریب تو ہائے روٹی، ہائے روٹی پکار رہے ہیں۔"

"جب اُنھیں پینے کو شراب میسّر ہو جائے گی وہ پکارنا بند کر دیں گے۔ شراب میں چاہے کتنے نقائص ہوں۔ ایک وصف یہ ہے کہ غم غلط کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ مجھے جوش ملیح آبادی کا ایک شعر یاد آگیا۔ لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے ؎

اٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے آگے خدا کا نام ہے ساقی!"

"شاید اسی لئے آپ جگہ جگہ شراب کے ٹھیکے قائم کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس سے حکومت کو دو فائدے ہوں گے۔ آمدنی میں معقول اضافہ ہوگا اور غرباء شراب پینے کے بعد بھول جایا کریں گے کہ وہ غریب ہیں۔"

"لیکن حکومت نے جو مکمل شراب بندی لاگو کرنے کا عہد کیا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"وہ عہد حکومت نے نہیں گاندھی جی نے کیا تھا اور ظاہر ہے حکومت اور

گاندھی جی دو مختلف چیزیں ہیں!"

"پچھلے پانچ برسوں میں حکومت نے غربت کو کس حد تک ختم کیا ہے؟"

"پانچ سال ایک ملک کی تاریخ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ابھی تک تو حکومت اعداد و شمار بھی اکھٹے نہیں کر سکی کہ ہمارے ملک میں غرباء کی صحیح تعداد کتنی ہے اور آیا ہمارے ملک میں کوئی شخص غریب بھی ہے یا نہیں؟"

"کیا حکومت واقعی یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی شخص غریب نہیں؟"

"غربت ایک اضافی ترکیب ہے۔ ممکن ہے جو اشخاص اپنے آپ کو غریب سمجھتے ہوں دراصل غریب نہ ہوں۔ وہ محض اس لئے اپنے کو غریب سمجھ رہے ہوں کہ دوسرے ان کے مقابلے میں امیر ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے غربت پر بھی نس بندی (Vasectomy) لگانا پڑے گی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ غربت پر نس بندی (Vasectomy) لگانا بہت ضروری ہے۔"

"آپ کے خیال میں غربت پر نس بندی لگاتے وقت کن امور کو مدِنظر رکھا جائے گا؟"

"میری رائے میں غربت پر نہیں بلکہ احساسِ غربت پر نس بندی لگائی جائے گی۔"

"آپ کا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ غربت بذاتِ خود بری چیز نہیں۔ کوئی الہامی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں غربت کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے۔ مبارک ہیں غریب کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُن کے لئے ہے۔ تکلیف دہ چیز تو احساسِ غربت ہے۔ علامہ اقبال نے شاید اسی احساس کو مٹانے کے لئے

اپنے فرزند جاوید کو نصیحت کی تھی ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر"

"آپ کا خیال ہے اگر احساسِ غربت مٹا دیا جائے تو غربت ختم ہو جائے گی۔"

"جی ہاں، صرف میرا ہی نہیں حکومت کا بھی خیال ہے۔"

"احساسِ غربت مٹانے کے لئے حکومت کیا تدابیر اختیار کر رہی ہے؟"

"حکومت کتابچے شائع کر رہی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ غربت ہر ملک میں موجود ہے۔ امیر ترین ممالک میں غریب ترین لوگ پائے جاتے ہیں۔ کمیونسٹ ممالک میں غرباء کو "کامریڈ" کہا جاتا ہے۔ امریکہ میں انہیں "راندۂ درگاہ" کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔ آج تک کوئی ملک دعویٰ نہیں کر سکا کہ اس نے غربت کو ختم کر دیا ہے۔"

"اگر حکومت کو یقین ہے کہ وہ غربت کو ختم نہیں کر سکتی تو وہ اسے ختم کرنے کا دعوے کیوں کرتی ہے۔"

"دعوے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے ضمیر کو سکون اور دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ عوام کی امید بندھتی ہے کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ کم از کم وقتی طور پر وہ ایک خوش آئند مستقبل کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔"

"لیکن جب عوام کی توقعات پوری نہ ہوں گی تو بے حد مایوس ہو جائیں گے۔ اس مایوسی کا ردِ عمل خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"عوام کبھی مایوس نہ ہوں گے۔ حکومت اور محبوب کے وعدۂ فردا پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں آج تک آپ نے کتنے لوگوں کو غربت سے نجات دلائی ہے؟"

"پانچ سو اشخاص کو۔"

"کیسے؟"

"پچھلے دنوں ہم ایک گاؤں میں گئے تھے۔ وہاں ہمیں پتہ چلا کہ پانچ سو اشخاص میں سے صرف پانچ غریب ہیں۔ ہم نے ان پانچوں کو اس گاؤں سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اب وہاں کوئی غریب نہیں۔"

"کچھ لوگوں کا خیال ہے جب سے آپ نے غربت ختم کرنے کا عزم کیا ہے غربت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہم سمجھتے ہیں یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ کیونکہ بقولِ غالب ؎

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!"

"شاطر صاحب آپ نے ہمارے سوالات کے بہت معقول جوابات دیے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو امیر مینائی کا ایک شعر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں بہت شوق سے!"

"جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا؟"

ذاتی مسائل

مِس قتالہ ایڈیٹر رسالہ صنفِ نازک کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔ اُنھوں نے اس ماہ کے "بہنوں کے سوالات" ہمیں بھجوا دیئے ہیں اور فرمائش کی ہے کہ ان کے جوابات ہم دیں۔ ساتھ ہی تاکید کی ہے ہر سوال کا جواب ایک نقطے میں دیا جائے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ "زہر دے" اس پر تاکید کر پینا ہوگا۔ والی صورتِ حال ہے۔ ہم نے اُن کے ارشاد کی تعمیل کرنے کی کوشش کی ہے :-

شاہ بانو شاہدرہ

س ۔ میں بہت بدصورت ہوں۔ میں نے آپ کے بتلائے ہوئے تمام نسخے آزمائے ہیں۔ انجام یہ ہوا کہ میں پہلے سے بھی زیادہ بدصورت نظر آنے لگی ہوں۔ اب تو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ بتلائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

ج ۔ صبر

نازک بدن لکھنؤ

س ۔ میں بے حد موٹی ہوں۔ ناشتے میں چار اُبلے انڈے، آٹھ ٹوسٹ، تین سیب اور چار کیلے کھاتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا چھ پراٹھوں، آدھ سیر سالن اور ایک پاؤ حلوے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس وقت میرا وزن ایک کوئنٹل اور بیس کلو ہے۔ جس چیز پر بیٹھتی ہوں وہ چور چور ہو جاتی ہے۔ اب تک چھ پلنگ، ۳۰ کرسیاں

اور تین اسٹول توڑ چکی ہوں۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ فاقہ۔

خوش باش بیگم حیدر آباد

س۔ میری طبیعت بہت چڑچڑی ہے۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتی ہوں۔ کسی پڑوسن سے نہیں بنتی۔ شوہر کے علاوہ بچوں سے بھی لڑتی رہتی ہوں۔ بتائیے مجھے کیا ہو گیا ہے؟

ج۔ مالیخولیا۔

شرافت النساء دہلی

س۔ مجھے چغلی کھانے کی عادت ہے۔ ساس، نند، دیورانی، جیٹھانی سب کی غیبت کرنے میں لطف آتا ہے لیکن جب کبھی پکڑی جاتی ہوں تو سب اس طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔؟

ج۔ توبہ۔

مہندر کور پٹیالہ

س۔ میں کہتی ہوں زیادہ سے زیادہ دو بچے ہونے چاہئیں۔ میرے شوہر کا خیال ہے کم از کم سات ہونے چاہئیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہم دونوں میں اکثر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ بتائیے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ سمجھوتہ۔

عقیلہ پروین شکارپور

س۔ میں سمجھتی ہوں اپنے شوہر سے زیادہ عقلمند ہوں۔ کبھی کبھی اس حقیقت کا اس شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں سجدے میں گر جاتی ہوں اور

خداوند کریم کا شکر بجالاتی ہوں کہ اس نے مجھے بے پناہ عقل و دانش سے نوازا ہے۔ بتائیے آپ اس کیفیت کو کیا کہیں گے؟

ج۔ غلط فہمی۔

ریشم کور سیری نگر

س۔ میری ریشمی ساڑھی پر تین دھبے پڑ گئے تھے۔ صابن، لیموں کا عرق، چونے کا پانی استعمال کر چکی ہوں، لیکن وہ غائب نہیں ہوئے۔ کوئی ایسی چیز بتائیے جس کے استعمال سے وہ غائب ہو جائیں۔

ج۔ قینچی۔

راج کماری الہ آباد

س۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ کروٹیں بدلتی اور تارے گنتی رہتی ہوں۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی چیز بتائیے کہ جس کے استعمال سے گہری نیند کا لطف لے سکوں۔

ج۔ کلوروفارم۔

گلبدن بھوپال

س۔ میرے چہرے پر بے شمار کیل، مہاسے اور ان کے نشانات ہیں۔ کوئی ایسی چیز بتائیے جس کے استعمال سے وہ نظر نہ آئیں۔

ج۔ برقع۔

کجلا دیوی کلکتہ

س۔ میں بہت صاف گو ہوں۔ ہر شخص کو اس کے منہ پر کھری کھری سناتی ہوں۔ بزرگوں تک کا لحاظ نہیں کرتی۔ بتائیے آپ اسے جرأت کہیں گے یا شجاعت؟

ج - حماقت -

ایلا - بنارس

س - جب میری ساس مجھے سخت سست کہتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں - سانس پھول جاتا ہے - ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں - چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے - اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے - اگر یہ ایک قسم کی "الرجی" نہیں تو اور کیا ہے ؟

ج - بزدلی -

شکنتلا - پٹنہ

س - میرا رنگ کالا - ہونٹ موٹے - ناک چپٹی ہے - میں چاہتی ہوں کسی طرح میرا رنگ گورا، ہونٹ پتلے اور ناک ستواں ہو جائے - بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟

ج - دُعا -

زہرہ بیگم رانچی

س - مجھے وہم ہو گیا ہے کہ میں دنیا کی خوبصورت ترین خاتون ہوں - ہیلن آف ٹرائے ، قلوپطرہ ، شکنتلا ، شیریں اگر آج زندہ ہوتیں تو میری گرد کو بھی نہ پہنچ سکتیں - کوئی ایسی چیز بتائیے جو مجھے اس وہم سے نجات دلائیے -

ج - آئینہ -

سرل کماری جے پور

س - میرا شوہر مجھے بڑی بے دردی سے پیٹا کرتا تھا - تین سال میں خاموشی سے پٹتی رہی - ایک دن میں نے احتجاج کیا - غصے میں آ کر اس نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں آدھ موئی ہو گئی - اس کے بعد وہ گھر سے چلا گیا - اور آج تک واپس

نہیں آیا۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ شکر۔

خوں خوار بیگم پشاور

س۔ مجھے اپنے شوہر کو پیٹنے کی عادت ہے۔ اکثر جب اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے تو مجھے بے ساختہ آثر لکھنوی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

اِدھر سے آج وہ گزرے تو منہ پھیرے ہوئے گزرے
اب اُن سے بھی ہماری بے کسی دیکھی نہیں جاتی

بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ رحم۔

لاڈو رانی للت پور

س۔ جب میں روٹھ جاتی ہوں۔ وہ پہروں مجھے مناتے رہتے ہیں، لیکن میں کسی طرح ماننے میں نہیں آتی۔ آپ اسے ناز و ادا کہیں گے یا کچھ اور؟

ج۔ ڈھٹائی۔

چکور بھوپالی

چکورؔ صاحب کے عجیب و غریب تخلّص کی تاویل یہ ہے کہ پندرہ برس کی عمر میں اُنھیں ایک پنواڑن سے جس کا نام چاند تھا، عشق ہو گیا۔ متواتر پانچ سال تک اُس کا دم بھرتے رہے، لیکن جب رسائی نہ ہوئی تو آپ نے چکورؔ تخلص کیا اور شاعری کرنے لگے۔ چاند کے فراق میں متعدد غزلیں کہیں جو بعد میں اُن کے مجموعوں "نغمۂ چکورؔ"، "نالۂ چکورؔ"، "فریادِ چکورؔ" اور "فغانِ چکورؔ" میں شامل کی گئیں۔ جب غزلیں کہتے کہتے طبیعت اُوب گئی تو افسانہ نویسی شروع کر دی۔ قریب قریب اپنے ہر افسانے میں اپنی محبوبہ کو جی بھر کر رُسوا کیا۔ اُس کے بعد یہ دیکھتے ہوئے کہ جاسوسی ناول مقبول ہو رہے ہیں۔ ادب کی اس صنف پر طبع آزمائی کی۔ اور دو درجن جاسوسی ناول لکھے۔ ان میں "قتلِ چکورؔ" شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے چاند کے ہاتھوں اپنے قتل ہو جانے کی داستان کو نہایت رقت انگیز اور پُر اسرار انداز میں بیان کیا ہے۔

چکورؔ صاحب کا خیال تھا، اگرچہ وہ بطور عاشق ناکام رہے ہیں، بحیثیت ادیب ان کی قدر کی جائے گی، لیکن افسوس ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی کسی نقادؔ نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ وہ برابر اصرار کرتے رہے —— میں بھی شاعر ہوں خدارا مجھے تسلیم کرو۔

کسی دوست نے انھیں بناتے ہوئے کہا "چکورؔ صاحب! جب تک ادیب

اپنی مدح سرائی خود نہ کرے، کوئی شخص اُسے ادیب تسلیم نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر اگر جارج برناڈشا اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنتے تو انھیں "شہرت کے لئے اور بیس سال انتظار کرنا پڑتا۔" اُنھیں یہ مشورہ پسند آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تازہ جاسوسی ناول "سراغ رساں کی موت" میں ہیرو اور ہیروئن کے مابین مندرجہ ذیل مکالمہ قلمبند کیا۔

"آج کل آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟"

"میں ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر، افسانہ نویس اور ناولسٹ جناب چکور بھوپالی کے مشہور ناول 'قتلِ چکور' کا مطالعہ کر رہی ہوں۔"

"آپ کے خیال میں چکور صاحب کس پائے کے ادیب ہیں؟"

"میری رائے میں رابندر ناتھ ٹیگور، سرت چندر چٹرجی اور منشی پریم چند کے بعد وہ سب سے بڑے ہندوستانی ناولسٹ ہیں۔"

"اگر یہ صحیح ہے تو پھر وہ مقبول کیوں نہیں ہوئے؟"

"ہر عظیم ادیب کا یہی حشر ہوتا ہے۔ رابرٹ براؤننگ اور غالب کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔"

"مگر موجودہ دور میں تو غالب اور براؤننگ کی کافی قدر افزائی ہوئی ہے۔"

"چکور صاحب کی قدر بھی آنے والی نسلیں کریں گی۔"

"مجھے آپ کے چکور صاحب بالکل پسند نہیں۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا مذاق حد درجہ پست ہے۔"

"لیکن نقاد انہیں کیوں منہ نہیں لگاتے؟"

"آج کل کے نقاد خود جاہل ہیں اُن سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے؟"

چکور صاحب سمجھتے تھے کہ اس مکالمے کو پڑھنے کے بعد قارئین اُن پر ایمان

لے آئیں گے اور ان کا شمار عظیم ادبا میں ہونے لگے گا، لیکن قارئین نے اُلٹا اُنھیں کا مذاق اُڑایا اور اس قسم کی علانیہ خود ستائی کو ان کی کور ذوقی پر محمول کیا۔

جب یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہوا تو چکور صاحب نے ایک نیا سٹنٹ (campaign) شروع کیا۔ وہ ہر لائبریری اور بک اسٹال پر جاتے اور تصانیفِ چکور کا مطالبہ کرتے۔ ایک بار انھیں دہلی سے کلکتے کا سفر درپیش تھا۔ جب گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رُکتی وہ بھاگم بھاگ ریلوے بک اسٹال پر پہنچتے اور پوچھتے "کیوں صاحب! آپ کے پاس "فریادِ چکور" ہوگی؟"

"نہیں۔"

"فغانِ چکور؟"

"نہیں۔"

"نالۂ چکور؟"

"نہیں۔"

"تعجب! معلوم ہوتا ہے آپ کے بک اسٹال میں کوئی کام کی کتاب نہیں!"

"نہیں صاحب۔ یہ بات نہیں۔ ہمارے پاس ٹیگور، غالب، اقبال، پریم چند کی تمام تصنیفات ہیں۔"

"جی چھوڑیئے۔ یہ تو اب پرانے ہو چکے۔ ٹیگور کا دور ختم ہوا اب تو چکور کا دور ہے۔"

ایک دن چکور صاحب ایک لائبریرین سے اُلجھ پڑے۔ مؤخر الذکر کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے تصنیفاتِ چکور کو سستے درجہ کا ادب قرار دیا تھا۔ چکور صاحب نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں جس لائبریری میں تصنیفاتِ چکور نہیں اُسے نذرِ آتش کر دینا چاہیئے۔ میرے نزدیک

ایک اچھی لائبریری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ اس میں ہندوستان کے عظیم ادیب چکور دھوبیالی کی تصنیفات پائی جائیں "۔

پھر ایک دن چکور صاحب کو خاصی خوشی حاصل ہوئی۔ ایک قصبے میں انھوں نے ایک کتب فروش سے 'فریادِ چکور' کا مطالبہ کیا اور اس نے بڑی کوشش کے بعد اس کتاب کی ایک جلد ڈھونڈ نکالی۔ چکور صاحب نے اس کتاب کی قیمت دریافت کی۔ کتب فروش نے کہا "ویسے تو اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے، لیکن پچھلے دس سال سے یہ کتاب میری دوکان پر پڑی سڑ رہی ہے۔ آپ اسے مفت لے جا سکتے ہیں"۔ چکور صاحب کی ساری مسرت کافور ہو گئی اور انھیں سخت حیرت ہوئی کہ جو کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اس کی اتنی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔

اس واقعے نے چکور صاحب کے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ ایک دم سنکی اور قنوطی بن گئے۔ انسان اور انسانیت سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے ہر شخص کو کوسنے دیتے۔ نیز انھیں یہ وہم ستانے لگا کہ انھیں نظر انداز کرنے کے لئے ایک منظم سازش کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس میں تمام لوگ شامل ہیں۔ اب جب بھی انھیں کوئی موقع ملتا وہ خوب دل کے پھپھولے پھوڑتے۔ ایک روز "تاریخِ ادبِ اردو" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "غضب خدا کا اس ضخیم کتاب میں ہر ایرے غیرے کی تعریف کی گئی ہے، لیکن اردو کے اس دیرینہ خادم کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یہ ادبی خیانت ہی نہیں خیانت بھی ہے۔ ستم ہائے ستم اُن ادبا کو آسمان پر چڑھایا گیا ہے جو ایک آدھ کتابچے کے مصنف ہیں، لیکن خاکسار کو اس لئے فراموش کیا گیا ہے کہ وہ تین درجن ناولوں، غزلوں کے چار اور افسانوں کے چھ مجموعوں کا خالق ہے"۔

جب انھیں کسی مشاعرے میں مدعو نہ کیا جاتا تو منتظمین کو پانی پی پی کر کوستے۔
"صاحب! آج کل تو گلے بازی اور ترنگ بندی کا نام شاعری ہے۔ حقیقی شاعری کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بخدا ہم وہ شعر کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کہے تو خون تھوک دے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں سامعین ہماری غزلوں پر سر دھنتے ہیں اور ہمارے ہر شعر پر مکرر مکرر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ ہمیں مشاعرے میں مدعو نہ کر کے وہ سامعین کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔"

پچھلے دنوں اخبارات میں اُن ادیبوں کی فہرست شائع ہوئی جنھیں سرکار نے اُن کی ادبی خدمات کے لئے انعامات عطا کئے تھے۔ اسے پڑھ کر چکور صاحب بہت سٹپٹائے۔ کیونکہ ان کا نام فہرست میں نہیں تھا۔ اب ان کا معمول ہو گیا کہ یہ فہرست ہر واقف اور دوست کو دکھاتے اور سینے پر دوہتڑ مار کر کہتے "اندھیر ہے صاحب اندھیر۔ اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے۔ کل کے چھوکروں اور ادبی عطائیوں میں انعامات تقسیم کئے جا رہے ہیں اور اردو کے اس جانے پہچانے ادیب کی نہایت بے دردی سے حق تلفی کی جا رہی ہے، لیکن افسوس کوئی خدا کا بندہ اس نا انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا۔"

آخر جب چکور صاحب کے شکوے سن سن کر ان کا ہر دوست عاجز آ گیا تو انھیں کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ وہ سرکار کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ (WRIT) دائر کر دیں۔

"رٹ دائر کر دوں!" انھوں نے چونک کر کہا۔ "لیکن اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

"بیوی کے زیور بیچ دیجئے اور جب رٹ منظور ہو جائے تو اُسے پھر بنوا دیجئے۔"

چکور صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے اللہ کا نام لے کر ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی اور اب اس کے نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ بھی دعا کیجئے کہ اس کا فیصلہ اُن کے حق میں ہو ورنہ وہ قبر میں بھی آرام سے نہ سو سکیں گے!

عالموں سے ملاقات

اب آپ چاہے اسے ہماری خوبی سمجھ لیجئے یا خامی، ہم عالموں پر جان چھڑکتے ہیں۔ ہمیں جب پتہ چلتا ہے کوئی عالم ہمارے شہر میں آیا ہے۔ ہم ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تاکہ اس سے تبادلۂ خیالات کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

چند ماہ کا ذکر ہے ایک عالم ہمارے شہر میں تشریف لائے۔ ان کے متعلق کہا گیا انھوں نے غالب پر سات سال تحقیق کرنے کے بعد ایک مقالہ لکھا ہے جس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری ملی ہے۔ ہم نے ان سے ملاقات کرنے کے لئے وقت مانگا۔ انھوں نے کہلوا بھیجا۔ "ہم آپ کو صرف تین منٹ دے سکتے ہیں۔" ہم نے اسے غنیمت جانا۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد اُن سے سوال کیا۔ "غالب کبھی تو زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں اور کبھی زندگی سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ کیا ہے؟"

انھوں نے سگریٹ کے دو، ایک کش لگانے کے بعد فرمایا۔ "حالانکہ ہم نے غالب پر کام کیا ہے، لیکن وہ ہمیں بالکل پسند نہیں۔ دراصل غالب ایک سپاہی زادہ تھے۔ انہوں نے تلوار کی بجائے قلم اٹھا کر بڑی غلطی کی۔ اس غلطی کا خمیازہ ان کے علاوہ ان کے مداحوں کو اٹھانا پڑا۔ اگر وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے میدانِ جنگ

میں اپنے جوہر دکھاتے تو بہت اچھے رہتے ۔ اُنھیں معقول تنخواہ ملتی اور فاقہ کشی سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جاتی ۔"

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کی ۔"آپ شاید بجا فرماتے ہیں ۔ لیکن ان کی شاعری میں جو تضاد ......"

"ہم اُسی تضاد کی تشریح کر رہے ہیں ۔ دیکھئے غالب دراصل فارسی کے شاعر تھے ۔ انہوں نے خود کہا ہے میری اردو شاعری بے رنگ ہے ۔ اگر آپ میری شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو میرا فارسی کلام ملاحظہ فرمائیے ۔ غالب ساری عمر یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ انھیں اردو میں شاعری کرنا چاہئیے یا فارسی میں ؟ معلوم ہوتا ہے کوئی غیبی طاقت انھیں اردو میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور کرتی تھی ۔ ستم یہ کہ وہ فارسی میں کہتے مگر بدقسمتی سے اُسے اردو سمجھتے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کوشش کرنے کے باوجود وہ اردو میں شاعری نہ کر سکے ۔ اردو میں شاعری کی ہے میر تقی میر نے ، شیخ ابراہیم ذوق نے اور نظیر اکبرآبادی نے ۔ غالب نے اردو میں پہیلیاں کہی ہیں ۔ معمے مرتب کئے ہیں ، شاعری نہیں کی ۔"

"معاف کیجئے ۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا ۔"

"دیکھئے صاحب ! جب غالب نے اردو میں شاعری نہیں کی ، اُس میں تضاد کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ بہرحال ہم آپ کو مشورہ دیں گے ، آپ اس کی زیادہ فکر نہ کیجئے ۔ یہ غالب کا ذاتی مسئلہ ہے ۔ اس ضمن میں آپ کو اقبال کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے ۔ اُنھوں نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

ہماری رائے میں آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ اگر آپ کوئی اور بات پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔"

"غالبؔ کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"غالبؔ کی سرے سے کوئی پرائیویٹ زندگی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ شاگردوں سے گھرے رہتے تھے۔ اُن کی ہر بات پبلک ہوا کرتی تھی۔ وہ جب تنہا بھی ہوتے عالمِ خیال میں اپنے شاگردوں کو پکارتے ——— "ارے بھئی مرزا ہرگوپال تفتہ کہاں ہو؟ میاں الطاف حسین حالی کس حال میں ہو؟" یہ غالبؔ کی بدنصیبی تھی کہ انھیں کبھی مکمل تنہائی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا بھی ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس سوال کے بعد ہم نے کوئی اور سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دو ایک ہفتہ کے بعد ایک اور عالم یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لئے آئے۔ وہ شیکسپیئر پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمیں بھی شیکسپیئر سے عشق ہے۔ ہم اُن کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ چند پروفیسروں کو یہ نکتہ ذہن نشین کرا رہے تھے ——— "اگر شیکسپیئر ڈرامے نہ لکھتا تو وہ بہت کامیاب جاسوسی ناول لکھ سکتا تھا۔"

ہم نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"شیکسپیئر کے ڈرامے سنسنی خیز واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'ہیملیٹ' ایک مقتول، دو قاتلوں اور ایک سراغ رساں کی داستان ہے۔ ایک ذہین سراغ رساں کی طرح ہیملیٹ قاتلوں کا سراغ لگاتا ہے، لیکن وہ

فطرتاً بزدل اور کم ہمت ہے، اس لئے ملزموں کو پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے خود قتل ہونے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔"

"بہت خوب!" ایک پروفیسر نے انھیں داد دیتے ہوئے کہا۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ "آپ کی دانست میں شیکسپیئر کی عظمت کا راز کیا ہے؟"

انھوں نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "یہ امر بحث طلب ہے کہ شیکسپیئر واقعی عظیم تھا۔ یہ صحیح ہے پچھلے چار سو سال میں اس سے بڑا ڈرامائسٹ پیدا نہیں ہوا، مگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آئندہ چار سو سال میں اس سے بہتر ڈرامائسٹ پیدا نہ ہوگا، اس لئے اسے عظیم کہنا قبل از وقت ہے۔"

ہم نے اُن کی اس دلیل سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ ادب میں شیکسپیئر کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

انھوں نے فوراً جواب دیا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ شیکسپیئر، شیکسپیئر ہے۔ اور اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں، ایسا کیوں ہے تو ہم کہیں گے یہ اُس کی مجبوری ہے۔ آخر وہ ڈانٹے، ٹالسٹائی اور کالی داس تو ہو نہیں سکتا۔"

ایک بار ہم ایسے عالم سے ملنے گئے، جو ویدانت کے مفسّر سمجھے جاتے تھے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ چند جملوں میں ویدانت کی تشریح کریں۔ انھوں نے جھک کر فرمایا۔ "خدا جانے آپ ویدانت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ویدانت تو ایک سمندر ہے۔ اُسے کوزے میں کس طرح بند کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم چھ مہینے اس کی وضاحت کرتے رہیں تو بھی یہ ویدانت کی محض تمہید ہوگی!"

ہم نے بہت ادب سے عرض کی۔ "یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن ہم نے

توصرف آپ سے ویدانت کی عام فہم تشریح کرنے کے لئے التجا کی تھی۔"
انھوں نے ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "ویدانت کوئی الجبرے کا فارمولا نہیں جو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ اسے سمجھنے کے لئے مطالعہ کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے وید پڑھئے۔ پھر شاستر، پران اور اُپنشد۔ اس کے بعد جو کچھ پڑھا ہے اس پر چند برس غور کیجئے۔ پھر ہمارے پاس آئیے۔ ہم آپ کو بتائیں گے ویدانت کیا ہے؟"
ہم نے آہستہ سے کہا "اگر اتنی فرصت یا قابلیت ہوتی تو آپ کے پاس کیوں آتے؟"
انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واقعی آپ نے ہمارے پاس آکر غلطی کی ہے۔ دیکھئے آپ ویدانت کے چکر میں نہ پڑیئے۔ اگر آپ اتنے سال ویدانت کے بغیر زندہ رہ سکے ہیں تو جو تھوڑی سی زندگی رہ گئی ہے وہ بھی اس کے بغیر گذار سکتے ہیں۔ آپ شاید نہیں جانتے سنگیت اور ویدانت کو سمجھنے کے لئے ایک جنم کی نہیں کئی جنموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکبر نے ایک بار تان سین سے پوچھا تھا انسان کتنے برسوں میں کسی ساز کو بجانے میں مہارت حاصل کر سکتا ہے؟ تان سین نے جواب دیا تھا "مہابلی! اگر وہ مسلسل سات جنم ریاض کرے تو شاید صحیح ڈھنگ سے تان پورا بجا سکے گا؟ ویدانت تو سنگیت سے بھی مشکل ہے۔ بہرکیف یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔"
ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اب سُنا ہے اگلے ہفتے ایک ماہرِ نفسیات ہمارے شہر میں تشریف لا رہے ہیں۔ اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گے۔ دیکھئے وہ نفسیات کے بارے میں کیا کہتے ہیں!!

ملکِ ادب کے بانکے

ایک زمانہ تھا کہ بقول رتن ناتھ سرشار لکھنؤ کے بانکے بڑی آن بان کے ساتھ گھروں سے نکلتے اور اینٹھتے ہوئے بازاروں میں سے گزرتے تھے۔ ان کے رعب اور طنطنے کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص ان کے سامنے آنے یا اُن سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر کمر سے پیش قبض نکالنا اور مرنے مارنے پر تیار ہو جانا اُن کا شیوہ بن چکا تھا۔ بیسویں صدی میں لکھنؤ کے بانکے قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب تو ملکِ ادب کے بانکوں کا دور دورہ ہے۔

ملکِ ادب کے بانکے پیش قبض کا کام زبان سے لیتے ہیں۔ ان کا خنجر وہ قلم ہوتا ہے جسے وہ کان پر نہیں بلکہ جیب میں رکھ کر گھر سے نکلتے ہیں اور اس قہوہ خانے کا رُخ کرتے ہیں جہاں اُن کا استقبال کرنے کے لئے ایک خاص قماش کے لوگ پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی ان کا حلیہ ملاحظہ کرنے کا موقع ملا ہو تو آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا۔ ان پر خسرو کا مشہور مصرع صادق آتا ہے:۔

بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

سر کے بال بڑھے ہوئے، صورت اجاڑ، بے نور آنکھیں، لباس نہایت غلیظ۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک۔ منہ میں کسی گھٹیا برانڈ کا

سگریٹ جس کے وہ کش پر کش لگاتے ہیں اور زندہ و مرحوم ادباء پر طعن و تشنیع کے تیر پر تیر چلاتے ہیں۔ اسے اِن کی تیر اندازی کا کمال سمجھئے کہ کوئی ادیب اُن کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ ملک ادب کے بانکوں میں ایک خاص وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی شخص کو ادیب تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ۱۹۷۰ء تک کے ادب کا شمار خرافات میں ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے انہیں اتنی "الرجی" ہوتی ہے کہ ادھر آپ نے کسی ممتاز ادیب کا نام لیا اُدھر جھٹ اُن کو چابی لگ گئی۔ "اجی چھوڑیئے یہ آپ کیا قصہ لے بیٹھے۔ آخر میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ نے لکھا ہی کیا ہے جس پر آپ فخر کر رہے ہیں۔ یہ تمام یاسیت اور قنوطیت کے شکار اور پرستار تھے۔ عمر بھر اپنی تنگدستی فاقہ مستی اور بیچارگی کا رونا روتے رہے۔ میرؔ تو اس قدر روئے کہ تعجب ہوتا ہے ان کی بینائی کس طرح قائم رہی۔ ہر تیسرے شعر میں اپنے رونے کا یوں ذکر کرتے ہیں۔ جیسے لڑائیتر مارا ہو۔ بھلا ایسا شاعر بھی کیا جو رونے کو مستقل پیشہ اور روزگار بنالے۔ غالبؔ نے مے نوشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اُنھیں قرض کی مے پینے میں کوئی عار نہ تھی۔ دراصل وہ ایک طرح کے ذہنی مریض تھے۔ ذوقؔ کی شاعری پند و نصائح کا پلندہ ہے۔ اُنھیں تو شاعر کی بجائے مُلّا ہونا چاہیئے تھا۔ باقی رہے مومنؔ ان کی شاعری میں وہی گل و بلبل کی تکرار ہے جس پر لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی، لیکن ہم لکیر کے فقیر قدیم شاعری کو سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ آپ ہی انصاف سے کہئے ایٹم اور جیٹ طیارہ کے دور میں اس قسم کی شاعری کی کیا وقعت اور ضرورت ہے۔

وہ اپنی تنقیص ختم کر کے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہیں۔ اس کا دھواں

آپ کے منہ کی طرف چھوڑتے ہوئے ایسا "پوز" بناتے ہیں۔ گویا انھوں نے قدیم شعراء کے علاوہ آپ کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے۔ آپ ان سے لاکھ کہیں جس شاعری کو وہ فضول اور لغو سمجھ رہے ہیں وہ ہمارے ادب کی آبرو ہے اور گل و بلبل محض استعارے ہیں جن کا سہارا لے کر قدیم شعراء نے غم دوراں کی تفسیر کی ہے۔ لیکن انھیں یقین نہیں آئے گا۔ وہ دو چار غیر ملکی نقادوں کا حوالہ دے کر کہیں گے۔ اس قسم کی جذباتی شاعری صرف کالج کے لونڈوں کو متاثر کر سکتی ہے۔

ملکِ ادب کے یہ نکے فرانسیسی یا اطالوی ادباء کو اپنا پیر و مرشد مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک قہوے کے دو چار گھونٹ بھرنے کے بعد کہتا ہے "سارتر نے کیا خوب کہا ہے۔ زندگی بے معنی اور لغو ہے۔" دوسرا اس کی تائید کرتے ہوئے کامیو کے ناول 'اجنبی' کا حوالہ دیتا ہے۔ تیسرا یہ محسوس کرتا ہے کہ سارتر اور کامیو کا اپنا اپنا مقام ہے، لیکن البرٹو موراویہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ چوتھا جدید ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے جاندار ادب کی تخلیق تو صرف اٹلی میں کی جا رہی ہے اور ادھر ہم ہیں کہ ابھی تک کبیر اور تلسی داس کی مدح سرائی میں مصروف ہیں۔

کبیرا کھڑا بازار میں سب کی مانگے خیر
نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

"سبحان اللہ! کیا اچھوتا فلسفۂ حیات ہے۔"

اس پھبتی پر سب بانکوں کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں۔ متقدمین کا فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ ہم عصروں کا پوسٹ مارٹم کرنے لگتے ہیں۔

"آپ نے پروفیسر نسیم کا ناول پڑھا؟"

"بکواس ہے۔"

"میری رائے میں اب پروفیسر میم کو لکھنے سے توبہ کر لینی چاہیئے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ جب ادیب سٹھیا جائے وہ ایک دم بور بن جاتا ہے۔"

"بور نہیں۔ گھمبیر بور (Gruesome Bore)"

"مجھے پروفیسر میم پر غصّہ کی بجائے رحم آتا ہے۔"

"آج کل بیشتر ادباء قابلِ رحم ہیں۔"

"آپ نے مس جیم کی کہانیوں کا نیا مجموعہ دیکھا ہوگا؟"

"میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا مس جیم کیا لکھتی ہیں؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں وہ کیوں لکھتی ہیں؟"

"غضب تو یہ ہے کوئی نقّاد بھی انہیں لکھنے سے منع نہیں کرتا۔"

"ان دنوں نقّاد ہیں کہاں۔ یاوہ گوئی کو تو تنقید نہیں کہتے۔"

"یاوہ گوئی بھی برداشت کی جاسکتی ہے، لیکن جب وہ بزعمِ خود کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔"

"علاج تو ہے۔ بشرطیکہ آپ ہمارا فارمولہ استعمال کریں۔"

"وہ کیا ہے؟"

"اس کی وضاحت کے لئے آپ کو ایک قصّہ سننا پڑے گا۔"

سب بانکے ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ اُن کا ساتھی اپنی روداد لہک لہک کر بیان کرتا ہے۔ جب ہمارا ناول 'زندگی کی موت' شائع ہوا۔ ایک ایڈیٹر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے فضول اور بیہودہ ناول ہم نے آج تک نہیں پڑھا۔" ہم نے اس گستاخ ایڈیٹر کو سبق پڑھانے کا فیصلہ کیا اُن کے دفتر میں پہنچے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد اُن سے عرض کی۔ ایک پرائیویٹ بات

کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ ہمیں ساتھ والے کمرے میں لے گئے ۔ ہم نے دروازہ بند کرنے کے بعد ایڈیٹر صاحب کے رخسارِ مبارک پر دو تھپیڑ رسید کئے اور کہا ۔
"آداب عرض! آئندہ ذرا سوچ سمجھ کر ادبا کی پگڑی اچھالئے گا۔ نہیں تو خاکسار کو دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا"

یہ دلچسپ قصّہ سن کر بانکے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں ۔ جس کا مطلب ہوتا ہے ایسے ایڈیٹر کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیئے تھا ۔

قہوے کا دوسرا دور چلتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہر ایک ادبی شہرت کو موت کے گھاٹ اتار نہیں دیا جاتا ۔ اس کے بعد بانکے کافی ہاؤس سے اینٹھے ہوئے نکلتے ہیں اور سڑک پر یوں اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں ۔ جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں ۔

کسی نے ہماری طرح سے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں ہے

ماسٹر کرامت

خدا بخشے ماسٹر کرامت بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر افسوس انھوں نے پیشے کا انتخاب کرنے میں دور اندیشی سے کام نہ لیا۔ طبعاً اور فطرتاً وہ ایک اداکار تھے۔ لیکن انھیں فارسی زبان سے عشق تھا، اس لئے ایک مڈل اسکول میں فارسی پڑھانے پر رضامند ہو گئے۔ اداکاری اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پڑھاتے وقت اکثر بھول جاتے۔ یہ اسکول کا کمرہ ہے تھیٹر نہیں۔ طلباء کو خاص تھیٹریکل انداز میں ڈانٹتے ہوئے کہتے۔ کم بخت! اسیاہ بخت! تم کندۂ ناتراش ہو۔ بدسیرت بدقماش ہو۔ یاد رکھو استادوں کا منہ چڑاؤ گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ تمہیں ہزار بار سمجھایا۔ حیف صد حیف تمہاری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

نہ سمجھا عمر گذری اُس بتِ خود سر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ یعنی تمہارے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں جب تمہارے مستقبل پر نظر دوڑاتا ہوں تو جو تمہارا حشر ہونے والا ہے اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔

تباہی کے خواب آ رہے ہیں نظر سب
مصیبت کی ہے آنے والی سحر اب

ماسٹر کرامت نے اداکاری کی تربیت پارسی تھیٹر میں حاصل کی تھی۔ وہاں سے ہی انھوں نے ایسے مکالمے ادا کرنے کا فن سیکھا جن کے الفاظ آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اور جن کا کلائمکس ایک ایسا شعر ہوتا ہے جو سامعین کو تالیاں پیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بہترین مکالمہ جسے ادا کرنے کا انھیں فخر حاصل ہوا یہ تھا۔ "چاروں طرف فوارے چھوٹتے ہیں۔ گویا آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں" اور بہترین شعر جسے سن کر سامعین تین منٹ تک تالیاں پیٹتے رہے۔ داغ کا شعر تھا۔

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

موصوف اپنی کامیاب اداکاری کا ایک واقعہ بڑے شوق سے سنایا کرتے تھے۔ ایک بار ڈرامہ "معصوم گنہ گار" میں ہیرو کا پارٹ کرتے وقت انھیں ایک شعر پڑھنا تھا۔ انہوں نے اپنی اچکن کا دامن پانی سے تر کر لیا۔ مکالمہ ادا کرنے کے بعد جب انھوں نے شعر پڑھا:۔

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اور اس کے ساتھ ہی دامن کو نچوڑا۔ اسٹیج پر اتنا پانی گرا جس سے واقعی دو ایک فرشتے وضو کر سکتے تھے۔ سامعین یہ ڈرامائی سچ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔

اسے حالات کی ستم ظریفی سمجھئے کہ ماسٹر کرامت کو مدرس بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ جب درسی کتب کو پڑھتے اور پڑھاتے دانت پیس کر رہ جاتے۔ "یہ کیسی خشک اور بے جان نثر ہے۔ قافیہ نہ ردیف۔ اس پر ستم یہ کہ ورق پر ورق الٹتے جاؤ کہیں کوئی شعر نظر نہیں آتا۔ اگر اس کی بجائے یوں ہوتا تو کتنا لطف آتا۔" وہ ایک

مغل شہزادہ تھا، سیر و شکار کا دلدادہ تھا۔ حسن کا پرستار تھا، رندانِ مے پرست کا سالار تھا۔ باشعور باتمیز تھا۔ عوام میں ہر دلعزیز تھا اور اس کے لیے ایک چٹپٹا شعر

رستم رہا زمانے میں نہ سام رہ گیا
مردوں کا آسمان تلے نام رہ گیا

ماسٹر کرامت اُن اداکاروں میں سے تھے جو کسی وقت بھی اداکاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اسکول سے گھر آتے تو بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ـــــ "اے گلشنِ کرامت کی بلبلِ ہزار داستان، اے رشکِ خوبانِ جہاں! ذرا ادھر آ۔ اور میٹھی میٹھی باتوں سے اپنے سرتاج کا دل بہلا۔ تاکہ تھکاوٹ دور ہو اور دل شاد و مسرور رہو۔ جب وہ ان کے نزدیک آتی اس کی طرف اشارہ کرکے یہ شعر پڑھتے" ؎

اثر لبھانے کا پیاری ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

ایک دفعہ انسپکٹر صاحب اسکول کا معائنہ کرتے آئے۔ انہوں نے ماسٹر کرامت سے دریافت کیا "کیا یہ صحیح ہے کہ بقول ہیڈ ماسٹر صاحب آپ ہر روز دیر سے آتے ہیں۔ آپ کے طلبا کا نتیجہ ہمیشہ خراب نکلتا ہے۔ آپ انھیں بڑی بے رحمی سے پیٹتے ہیں"۔ ماسٹر کرامت نے دست بستہ عرض کی "جان کی امان پاؤں تو چند الفاظ زبان پر لاؤں۔ صحیح صورتِ حال سے آپ کو اس طرح آگاہ کروں گا کہ صرف ایک شعر پڑھنے پر اکتفا کروں گا۔ شعر سماعت فرمائیے :-

چپ رہے ہم ادب سے محشر میں
ورنہ کس بات کا جواب نہ تھا

ماسٹر کرامت میں یہ وصف تھا ۔ جو پارٹ ادا کرنے کے لئے انھیں دیا جاتا اُسے اتنی خوبی کے ساتھ نبھاتے کہ حاضرین دم بخود ہو کر رہ جاتے ۔ ایک بار لڑائی کے ایک منظر میں اپنے رقیب پر اس شدت سے تلوار کا وار کیا کہ وہ بے چارا مہینوں اسپتال میں مرہم پٹی کراتا رہا ۔ ایک دن اپنے کمرے میں پاگل کے پارٹ کی اتنی نیچرل ریہرسل کی کہ کسی پڑوسی نے پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ کو فون کر دیا ۔ جس مفرور کی آپ کو تلاش ہے وہ ہمارے محلّے میں موجود ہے ۔

مرحوم کی موت بھی عجیب حالت میں ہوئی ۔ ٹاؤن کلب کے زیرِ اہتمام ڈرامہ شیریں فرہاد اسٹیج کیا گیا ۔ اس میں ماسٹر کرامت کو فرہاد کا پارٹ ملا ۔ آخری منظر میں جب انھوں نے یہ شعر پڑھا :-

تری میعادِ غم پوری ہوئی اے زندگی خوش ہو
قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے لے تجھے آزاد کرتا ہوں

تو سبحان اللہ کا ڈونگرا برس گیا ۔ اس داد سے متاثر ہو کر اور کچھ جوش میں آ کر انھوں نے تیشہ اتنے زور سے اپنے سر پر مارا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے جاں بحق ہو گئے ۔ حاضرین سمجھے ایکٹنگ کر رہے ہیں ۔ ابھی تالیوں کا شور سن کر اٹھیں گے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ لچک لچک کر آداب عرض ۔ آداب عرض کہیں گے ۔ لیکن جب وہ چار پانچ منٹ تک نہ اُٹھے تو ڈاکٹر کرٹرنے آ کر اُن کی نبض دیکھی اور بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کیا کہ کرامت صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

اگرچہ مرحوم اب اس دنیا میں نہیں رہے ۔ اُن کی یاد اہلِ نظر کو ہمیشہ تڑپاتی اور گرماتی رہے گی ۔ بے شک اب وہ باغِ بہشت میں حوروں سے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں گے یا تصویرِ حیرت بنے کسی فرشتے سے یہ کہہ رہے ہوں گے ۔

زندگی آج بیک گام کہاں لے آئی
ناگہاں گردشِ آلام کہاں لے آئی

یا خالقِ کون و مکاں سے اُلجھ رہے ہوں گے کہ اے خدا تیری جنّت میں اور تو سب کچھ ہے، لیکن کوئی تھیئٹر نہیں جہاں خاکسار اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اور تشنگانِ شعر و سخن کی پیاس بجھائے۔

نہ کاہو سے دوستی

مرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں اعتراف کیا ہے کہ وہ آدمی سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے کتے کا کاٹا پانی سے ڈرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انھیں آدمیوں نے کاٹا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرزا غالب نے یقیناً یہ شعر اپنے تلخ تجربے کی بناء پر کہا ہوگا۔ قیاس غالب ہے جن لوگوں سے وہ ڈرتے تھے وہ ان کے احباب تھے۔ جو وقت بے وقت ان کے ہاں آدھمکتے۔ مفت کی شراب پیتے اور رخصت ہوتے وقت ان کی غزلیں اڑا کر لے جاتے۔ لیکن جب مرزا پر مصیبت آتی تو اُن سے اس طرح آنکھیں چراتے جیسے مرزا کے ساتھ ان کی صاحب سلامت تک نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا ہم بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ دوست بڑی نعمت ہیں۔ اس وقت ہم "ہتوپدیش" کے اس مقولے پر عمل کیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ دوستی کرنا چاہیئے۔ دیکھئے کبوتروں کو اُن کے ایک دوست نے جو چوہا تھا جال کی قید سے آزاد کیا تھا۔ ہم سوچا کرتے تھے حالانکہ انسان کبوتر تو نہیں پھر بھی آئے دن طرح طرح کے جالوں میں پھنستا رہتا ہے جنھیں کاٹنے

کے لئے چوہوں کی بجائے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے کئی دوست بنائے لیکن انھوں نے ہمارے دل پرایسے چرکے لگائے کہ ہمیں محسوس ہونے لگا، حافظ نے یہ شعر ہمارے بارے میں ہی کہا تھا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

اب ہم نے کچھ دنوں سے بھگت کبیرؔ کے اس قول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر۔ ہم کبیرؔ صاحب کی طرح بازار میں کھڑے ہوکر سب کی خیر تو نہیں مانگتے۔ البتہ سب احباب سے پناہ ضرور مانگتے ہیں۔ اب ہمارا یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا جارہا ہے کہ جس شخص نے بھی دوست بنانے کی غلطی کی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر مصیبتوں کو دعوت دی ہے۔ ہمارا تجربہ ہے فی زمانہ ایسی بیوی مل سکتی ہے جو بات و نی اور آرام طلب نہ ہو، ایسا نوکر مل سکتا ہے جو کام چور اور حرام خور نہ ہو۔ ایسا گھی بھی مل سکتا ہے جس میں ملاوٹ کے علاوہ گھی بھی ہو، لیکن ایسا دوست نہیں مل سکتا جس میں خلوص اور بوئے وفا ہو۔ ممکن ہے آپ سمجھ رہے ہوں ہم مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ جی نہیں۔ آپ ذرا ہمارے ان دوستوں کے کارنامے ملاحظہ فرمائیں جن سے تنگ آکر ہم نے دوستی سے توبہ کرلی۔

ہمارے ایک دوست ورما صاحب تھے۔ اتنے زود رنج اور نازک مزاج کہ بات بات پر روٹھنا ان کا معمول بن گیا تھا۔ ادھر ہم نے کسی بات پر اُن سے اختلاف کیا اُدھر وہ روٹھ گئے۔ اب ہم منت سماجت کر رہے ہیں۔ پندرہ سال کی رفاقت کا واسطہ دے رہے ہیں، لیکن وہ کسی طرح منے میں نہیں آتے ——
ایک دن وہ کہنے لگے، اتوار کو ہمارے ہاں آئیے گا۔ ہم نے کوی کھنگور کو مدعو کیا ہے۔ ہم نے عرض کی اتوار کو ہم نہ آسکیں گے۔ ہمیں فلاں جگہ جانا ہے۔ فرمایا اگر آپ

نہ آئے تو ہم آپ کو عمر بھر معاف نہ کریں گے۔ یہ ہمارے وقار کا سوال ہے۔ کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھ کر ہم اتوار کو ان کے ہاں پہنچے۔ وہاں کوئی گھنگھور سے جن کو اصل میں "مہابور" کہنا چاہیئے۔ ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی فضول سی تیرہ باتیں سنا کر اتنا بور کیا کہ سارا ہفتہ طبیعت بدمزہ رہی۔ ایک بار دورما صاحب اس لئے روٹھ گئے کہ ہم نے اپنے مضمون میں ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ہم نے اپنی صفائی میں کہا۔ اس مضمون میں آپ کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ انھوں نے جواب میں ایک مصرعہ پڑھ دیا: ؎

دل ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ایک اور دفعہ اس لئے ناراض ہو گئے کہ ہم نے اپنی نئی کتاب اُن کے نام کیوں منسوب نہیں کی۔ ہم نے انہیں یقین دلایا اس سے اگلی کتاب کا انتساب آپ کے نام کیا جائے گا۔ انھیں یہ تجویز پسند نہ آئی۔ کہنے لگے۔ یہ بھیک اس کو دیجیئے جس کا خدا نہ ہو۔

ایک اور دوست شاطر صاحب تھے اُن کا شیوہ تھا ہمیشہ بے وقت تشریف لاتے اور تین چار احباب کو ہمراہ لاتے۔ کبھی رات کے بارہ بجے دروازہ کھٹکھٹاتے، کبھی صبح کے چار بجے ٹیکسی کا کرایہ ہم سے دلواتے۔ کیونکہ ہمیشہ اُن کے بٹوے میں سو سو کے نوٹ ہوتے۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعارف کراتے اور تنبیہ کرتے کہ ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھئے گا ـــــ یہ ہمیں جان سے بھی عزیز ہیں۔ ستم یہ کہ اُن کے تمام احباب رند بلا نوش ہوتے جو پینے کے بعد خرمستیوں پر اُتر آتے۔ ہمیں پچاس ساٹھ روپے سے ہاتھ دھونا پڑتے اور نیند علیحدہ خراب ہوتی لیکن مرزا صاحب بوقت رخصت ہمیشہ یہ طعنہ دیتے کہ ہم نے بخیلی سے کام لیا ہے، اس لئے آئندہ وہ ہمارے گھر میں قدم نہ رکھیں گے۔

ہفتہ عشرہ بعد وہ اپنا عہد فراموش کر کے پھر تشریف لے آتے اور اپنے احباب کی موجودگی میں یہ اعلان کرتے۔ پچھلی بار آپ نے ہمیں ٹرخا دیا تھا۔ اگر اس بار بھی وہی حرکت ہوئی تو وہ خبر لیں گے کہ یاد رکھئے گا۔

ہمارے ایک ہم جماعت مدت سے بے کار تھے۔ ہمارے کالج میں ایک لیکچرار کی اسامی خالی ہوئی۔ ہم نے پرنسپل صاحب سے سفارش کر کے انھیں ملازمت دلوادی۔ انھیں کوئی کام کا مکان دستیاب نہ ہوا۔ دو مہینے اپنے گھر رکھا۔ کالج میں پاؤں جمانے کے بعد انھوں نے پرنسپل صاحب سے راہ و رسم پیدا کی۔ اُن کے بچوں کو مفت پڑھاتے گئے۔ گاہے گاہے انھیں تحفے بھجوانے لگے۔ جب اُن کے منظورِ نظر بن گئے تو انھوں نے ہماری جڑ کاٹنے پر کمر باندھ لی۔ کبھی ان سے کہتے "ان سے بچ کر رہئیے گا، یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں" کبھی کہتے یہ آپ کے خلاف ہر وقت زہر اُگلتے رہتے ہیں۔ پرسوں کہہ رہے تھے آپ جیسا نالائق پرنسپل سارے ایشیا میں نہیں ملے گا۔ جب ہمیں اس خدا واسطے کے بیر کا پتہ چلا ہم نے ان سے شکایت کی آپ سے ایسے سلوک کی توقع نہ تھی۔ انھوں نے صاف مکرتے ہوئے جواب دیا "بخدا آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں ایسا احسان فراموش نہیں۔ میں تو پرنسپل صاحب کو مشورہ دیا کرتا ہوں آپ کو وائس پرنسپل بنا دیں۔

چنانچہ جڑ کاٹے جائیں، پانی دیئے جائیں کے مصداق انھوں نے یہ شغل جاری رکھا۔ پرنسپل صاحب کے کان کچھ اس طرح بھرے کہ جب ایک سال طلبہ کی تعداد کم ہو گئی۔ انھوں نے ہمیں ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ہم کالج سے یہ مصرع پڑھتے ہوئے نکلے: ؏

بنایا تھا جنہیں اپنا وہ مارِ آستیں نکلے

آغا صاحب دس سال ہمارے دوست رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے

سینکڑوں چیزیں ہم سے مستعار لیں جن میں سے کوئی چیز کبھی واپس نہیں کی ۔ جو اشیاء وہ مانگ کر لے گئے ان میں تین سو رسائل، ڈیڑھ سو کتابیں، دو درجن ٹائیاں، چھ مفلر، تین پلنگ، چار کرسیاں اور ایک بائیسکل شامل ہے۔ قرض کا ہم اس لئے ذکر نہیں کرتے کہ ہم نے ان کو قرض کبھی اس امید پر نہیں دیا کہ وہ اُسے واپس کریں گے ۔ البتہ وہ ہمیشہ ہمیں یقین دلاتے رہے کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ ہماری پائی پائی چکا دیں گے ۔ دس برسوں میں مہینے کی وہ پہلی تاریخ کبھی نہ آئی جس کی آمد پر انھیں ہمارا قرض چکانا تھا۔

اب جب ہم نے نہ کاہو سے دوستی کے اصول پر عمل کیا ہے ہم بڑے مزے میں ہیں ۔ ہمیں کسی شخص کی خواہ مخواہ ناز برداری کرنا نہیں پڑتی ۔ کوئی بن بلایا مہمان وقت بے وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹا کر ہمارے آرام میں مخل نہیں ہوتا ۔ کسی ناہنجار کو قرض دینے کے بعد ہمیں انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ وہ اسے کب واپس کرے گا ۔ ہم اپنا سارا وقت اپنے ذاتی مسائل کو سلجھانے میں صرف کرتے ہیں ۔ اور جب کبھی ان لوگوں کی یاد آتی ہے ۔ جو بقول خود کبھی ہمارے دوست تھے تو زیر لب مسکرا کر ساحر لکھنوی کا یہ شعر پڑھ لیتے ہیں ؎

دنیا میں اب خلوص ہے بس مصلحت کا نام
بے لوث دوستی کے زمانے گذر گئے

مرزا کامل

مرزا کامل اُن اشخاص میں سے ہیں جن پر مولانا حالی کا یہ مصرع صادق آتا ہے :-

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ویسے دیکھنے میں وہ بھلے چنگے نظر آتے ہیں، لیکن اپنی گفتگو میں کچھ اس انداز سے دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ سامعین انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات اُن کے عجیب و غریب ارشادات پر لطائف کا گمان ہوتا ہے۔ لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں۔ مرزا پر طرح طرح کے فقرے کستے ہیں، لیکن مرزا پریشان ہوتے ہیں نہ پشیمان۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

ایک مجلس میں "مونالیزا" کا ذکر چل رہا تھا۔ کسی شخص نے مرزا کی رائے دریافت کی۔ انھوں نے چٹخارے لیتے ہوئے فرمایا۔ "اجی صاحب! کیا بات ہے مونالیزا کی۔ یونان کی یہ حسین ترین رقاصہ سکندرِ اعظم کی خاص الخاص منظورِ نظر تھی۔ کہتے ہیں جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا وہ اس کے ساتھ گئی تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں دارا کو سکندر نے نہیں مونالیزا نے قتل کیا تھا۔ مرنے سے پہلے دارا نے مونالیزا کو مخاطب کرتے ہوئے ایک فارسی کا شعر پڑھا تھا جس کا

مفہوم اردو کے ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے :-

ہم کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے

ایران سے مونا لزا مصر پہنچی ۔ وہاں اس کی ملاقات کلوپیترا سے ہوئی ۔ کلوپیترا کے محل میں "انیتھنی" نے اُسے دیکھ کر کہا تھا " کاش کلوپیترا کی بجائے مجھے تم سے عشق ہوتا "

اُس شخص نے مرزا صاحب کو مطلع کرتے ہوئے کہا "حضور مونا لزا تو ایک مشہور تصویر کا نام ہے جسے لیونارڈو ڈاونچی کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے"۔ مرزا نے اپنے اوسان ٹھکانے رکھتے ہوئے جواب دیا "ہم گوشت پوست کی مونا لزا کی بات کر رہے ہیں ۔ یہ مونا لزا اس زمانے میں ہوئی جب تمہارا لیونارڈو ڈاونچی پیدا بھی نہیں ہوا تھا ۔ یہ وہی مونا لزا ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا ۔ اگر اس کی ناک ذرا اور تیکھی ہوتی تو وہ آدھی دنیا کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کر سکتی تھی "

"ہم نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے"

"آئندہ یاد رکھئے گا"

ایک اور محفل میں اس موضوع پر بحث ہو رہی تھی ۔ آیا کالی داس شیکسپیئر سے بڑا ڈراماٹسٹ ہے یا نہیں ۔ مرزا نے بحث میں حصّہ لیتے ہوئے یہ فتویٰ صادر کیا ۔ "کالی داس چوتھی اور شیکسپیئر سولھویں صدی میں ہوا ۔ اس لئے کالی داس شیکسپیئر سے بارہ صدیاں بڑا ڈراماٹسٹ ہے ۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ کالی داس سے چرائے ہیں "۔

"مثال کے طور پر؟" کسی نے سوال کیا۔
"ہیملیٹ" کا پلاٹ "شکنتلا" سے چرایا گیا ہے۔"
"ان دونوں کے پلاٹ میں کوئی مشابہت نہیں۔"
"ہے کیسے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے ہیملیٹ پڑھا ہے نہ شکنتلا۔"
"آپ ہی بتائیے ان دونوں کے پلاٹ میں کون سی چیز مشترک ہے۔"
"دونوں میں ایک ہیرو جو ہیروئن سے محبت کرتا ہے۔"
"یہ بات تو آپ ہر ڈرامے کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔"
"ہرگز نہیں۔ جارج برنارڈ شا کے ڈراموں میں نہ ہیرو ہوتا ہے نہ ہیروئن۔ صرف جارج برنارڈ شا ہوتا ہے۔"
ایک دفعہ دو اشخاص میں ایک شعر کے متعلق جھگڑا ہو گیا۔ دونوں مرزا کے پاس پہنچے اور ان کی رائے طلب کی۔ مرزا نے کہا شعر پڑھیے۔ شعر پڑھا گیا۔ انہوں نے دو ایک بار خود پڑھا اور فرمایا واقعی بے نظیر شعر ہے:۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

"مرزا صاحب! میں کہتا ہوں یہ شعر غالب کا ہے۔ میرے دوست کی رائے ہے ذوق کا ہے آپ کا کیا خیال ہے؟"
"حضرات! آپ دونوں غلطی پر ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے نہ ذوق کا۔ دراصل اسے تین شاعروں نے مل کر کہا اور وہ تھے جناب دل شاہجہاں پوری، جناب جگر مرادآبادی اور محترمہ ادا بدایونی۔ ثبوت اس بات کا یہ کہ تینوں کے تخلص شعر میں موجود ہیں۔"
اسی طرح کا ایک اور واقعہ اس دن ہوا جب ایک طالب علم نے مرزا

سے فانی کے اس شعر کی تشریح کرنے کے لئے کہا:۔

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

مرزا نے بڑی سنجیدگی سے کہا "یہ ایک مزاحیہ شعر ہے۔ عاشق اپنی محبوبہ کو ڈرانے کے لئے کفن میں گھس جاتا ہے۔ دو ایک منٹ مُردے کی طرح لیٹے رہنے کے بعد پھر سکوت توڑتا ہے اور محبوبہ کی بے رُخی پر طنز کرتے ہوئے اسے کفن سرکانے کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس چھیڑ چھاڑ سے لُطف اندوز ہو رہا ہے ورنہ اگر اس کی واقعی موت ہو گئی ہوتی تو وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکتا۔ چہ جائیکہ شعر کہہ سکے"۔

حالانکہ مرزا نے کسی غیر ملک کی سیاحت نہیں کی۔ تاہم جب کوئی شخص کسی غیر ملک کا ذکر چھیڑتا ہے وہ اس میں دخل دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایک نوجوان جو لندن سے لوٹا تھا "ہائیڈ پارک" کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ مرزا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں! ہائیڈ پارک انگلینڈ کی سب سے بڑی کھالوں کی منڈی ہے۔ وہاں ہر قسم کے جنگلی جانوروں کی کھال مل جاتی ہے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے وہاں ایک لومڑی کی کھال دو پونڈ میں خریدی تھی"۔

"لیکن صاحب! ہائیڈ پارک کھالوں کی منڈی نہیں۔ ایک پارک کا نام ہے جہاں تقریر کی مکمل آزادی ہے"۔

"آپ کا قیاس بالکل غلط ہے۔ اگر یہ محض پارک ہوتا پھر اس کا نام ہائیڈ پارک رکھنے کی کیا ضرورت تھی"۔

اور کل شام تو مرزا کامل نے کمال ہی کر دیا۔ جب ایک مصری سیاح نے اُن سے دریافت کیا "آپ کبھی مصر بھی گئے ہیں؟"

"جی ہاں کئی بار مصر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔"

اہرامِ مصر بھی دیکھے؟"

"دیکھے" مرزا نے چونک کر کہا۔ "اُنہی کے ہاں تو ہمارا قیام رہا۔ وہ ہمارے جگری دوست ہیں۔ مصر میں اُن سے بڑھ کر مہماں نواز رؤسا شاید ہی ہوں گے۔"

"اور ابوالہول؟"

"اوہ مولانا ابوالہول۔ اُن سے ایک قہوہ خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ بہت دیر تک مصر اور ہندوستان کی پرانی تہذیبوں سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔"

اب مصری سیاح کے چونکنے کی باری تھی۔ "لیکن مرزا صاحب اہرامِ مصر تو مینار ہیں اور ابوالہول ایک بُت کا نام ہے۔ جس کا چہرہ عورت اور دھڑ ببر کا ہے۔"

مرزا صاحب نے ذرا بھر بھی ۔۔ نہ جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھیے صاحب! جب ہم مصر گئے تھے تب تو اہرامِ مصر کا شمار رؤسا میں ہوتا تھا۔ اور ابوالہول مولانا کہلاتے تھے۔ اب اگر گردشِ زمانہ سے وہ میناروں اور بُت میں تبدیل ہو گئے ہوں تو ہم کہہ نہیں سکتے۔"

مصری سیاح نے غالب کا مصرع زیرِ لب دہرایا ۔۔۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے ۔۔۔ اور خاموش ہو گیا۔

بہت مشکل ہے دُنیا کا سنورنا

روشن کباڑی نے ایک عجیب و غریب چراغ جس پر چند الفاظ کسی اجنبی زبان میں کندہ تھے، مجھے دکھلاتے ہوئے کہا "میرے خیال میں، یہ وہی چراغ ہے جس کی تلاش آپ برسوں سے کر رہے ہیں۔"

میں نے فوراً وہ چراغ خرید لیا اور اپنی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کے بعد میں نے اُسے روشن کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اُس میں سے لال رنگ کے دھوئیں کا غبار سا اٹھا۔ جس نے آہستہ آہستہ ایک جن کی صورت اختیار کر لی۔ یہ جن اُن تمام جنوں سے مختلف تھا جن کا ذکر قصے کہانیوں میں آتا ہے۔ وہ نیکر اور ٹیش شرٹ میں ملبوس تھا اور ڈیل ڈول میں فلمی ٹارزن سے مشابہت رکھتا تھا۔ اُس نے عربی کے بجائے انگریزی میں مجھے گڈ مارننگ کہنے کے بعد پوچھا "کہیے۔ مجھے کیسے یاد فرمایا؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا "یونہی کوئی خاص بات نہیں ویسے ہی — میرا مطلب ہے ... یعنی ....!"

"دیکھیے گھبرانے یا شرمانے کی ضرورت نہیں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"خدمت! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ہے فی الحال۔"

"آپ خواہ مخواہ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ کہئے آپ کی خدمت میں ہالی وڈ کی خوبصورت ترین ایکٹریس پیش کر دوں؟ آپ کو وہ راکٹ لا کر دوں جس کی مدد سے آپ چاند کی سطح پر اتر سکتے ہیں یا آپ کو کسی بڑے ملک کا وزیر اعظم بنا دوں۔"

میں نے پہلے سے بھی زیادہ گھبرا کر کہا "نہیں۔ نہیں۔ مجھے ہالی وڈ کی ایکٹریس کی ضرورت نہیں۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میں چاند کی سیر بھی نہیں کرنا چاہتا۔ وہاں آکسیجن ہے نہ پانی۔ وزیر اعظم تو کجا میں پریذیڈنٹ بھی بننا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"تو پھر شاید آپ کو دولت کی ضرورت ہے۔ آپ دوبارہ جوان ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کسی دشمن سے خوفناک انتقام لینا چاہتے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے ان میں سے کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔"

"تعجب!" جن نے مسکرا کر کہا "آپ عجیب آدمی ہیں۔ آپ نے مجھے خواہ مخواہ بلوا بھیجا۔"

"معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

چشم زدن میں وہ غائب ہو گیا۔ مجھے اپنی کم ہمتی پر بہت ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا آئندہ پروگرام مرتب کرنے کے بعد ہی اُسے بلواؤں گا۔ میں متواتر تین دن سوچتا رہا کہ اُس کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے کسی ذاتی مسئلے کی بجائے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لئے کہا جائے۔ کیونکہ اجتماعی مسائل کو سیاست دانوں اور

قومی رہنماؤں نے کچھ اس طرح الجھا دیا ہے کہ کوئی جن ہی اُنھیں سلجھا سکتا ہے۔

چوتھے دن جب میں نے چراغ جلایا اور جن نمودار ہوا تو میں نے بڑی خود اعتمادی سے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں نے سُنا ہے تم مشکل سے مشکل کام کر سکتے ہو۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔"

"کیا تم اُن تمام ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کو جو چند ممالک کے قبضے میں ہیں چرا کر بحرالکاہل میں پھینک سکتے ہو۔؟"

"کیوں نہیں۔ لیکن بیچارے سمندری جانوروں کی شامت آجائے گی۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ مر جائیں گے۔ کوئی مضائقہ نہیں، لیکن انسان، انسانیت اور تمدّن تو تباہ ہونے سے بچ جائے گا۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔"

"ابھی جاؤ اور یہ کام کرنے کے بعد مجھے مطّلع کرو تاکہ میں تمہیں دوسرا کام بتا سکوں۔"

"بہتر!"

"لیکن مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ تم نے یہ فرض انجام دے دیا؟"

"اخبارات کے مطالعے سے۔"

دوسرے دن ہر اخبار کی پہلی سُرخی میں ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی پُراسرار چوری کا ذکر تھا۔ لطف یہ کہ سرمایہ دار ممالک نے کمیونسٹوں اور کمیونسٹ ممالک نے سرمایہ داروں کو اس چوری کے لئے ذمّہ دار ٹھہرایا تھا۔ لیکن میں خوش تھا کہ ایک عظیم خطرہ جو انسانیت کے سر پر مدّت سے منڈلا رہا تھا، ٹل گیا ہے۔

جب جن اس مہم کو سر کرنے کے بعد میرے پاس آیا تو میں نے اُسے شاباش دیتے ہوئے کہا "تم نے واقعی کمال کر دیا اب اس سے بھی زیادہ مشکل کام کرنے

کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں دنیا میں جتنے بھی سیاست داں ہیں، وہ راتوں رات سب گونگے ہو جائیں۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

صبح کو ہر ریڈیو اسٹیشن سے یہ خبر نشر کی گئی کہ ایک عجیب طرح کا گونگا پن جو صرف سیاست دانوں پر حملہ کرتا ہے، وبا کی طرح پھیل گیا ہے۔ لوگوں نے یہ خبر سن کر اطمینان کی سانس لی کہ اب کوئی سیاست دان فضول بیان دے کر انھیں گمراہ کرنے کی کوشش نہ کریگا۔ "مسٹر جن! تمہارا تیسرا کام یہ ہے کہ ہر شادی شدہ عورت کو بیس سال کے لئے اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنا دو۔"

"جناب! یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک مستورات کے جسمانی نظام میں چند اہم تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ اس کام کے لئے مجھے کچھ مہلت دیجئے۔"

"کیا ایک ہفتہ کافی ہوگا؟"

"نہیں۔ کم از کم ایک مہینہ۔ مجھے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جنوں کی پوری فوج تعینات کرنا پڑے گی۔"

ایک ماہ کے بعد جب جن سے ملاقات ہوئی تو اُس نے یہ خوش خبری سنائی کہ اب ہر ایک شادی شدہ عورت عارضی طور پر بانجھ بنا دی گئی ہے۔ میں نے اُسے اُس کے چوتھے کام کی نوعیت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا "تم جانتے ہو دنیا کے کُل رقبے کا صرف چوتھا حصہ خشکی ہے۔ باقی تین حصے پانی پر مشتمل ہیں۔"

"جانتا ہوں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تین چوتھائی خشکی اور ایک چوتھائی پانی ہو جائے۔"

"آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟"

"تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے رہائش اور خوراک کے مسائل کو حل کیا

جا سکے۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے۔ بہر حال سوچنا پڑے گا۔"

"میری دانست میں پانی کو بخارات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یا بڑے بڑے ریگستانوں کو اٹھا کر سمندروں میں . . . . پھینکا جا سکتا ہے۔"

"اس سے آپ کا مطلب حل نہ ہوگا۔ بخارات بارش کی صورت میں زمین پر لوٹ آئیں گے اور ریت پانی میں گھل جائے گی۔"

"کیا کوہِ ہمالہ کو اٹھا کر بحرِ ہند میں پھینک سکتے ہو۔"

"تجربہ کرنا پڑے گا۔ میں نے اتنا بڑا وزن آج تک نہیں اٹھایا۔"

"کوہِ ہمالیہ نہ سہی، چٹان تو اٹھا لو گے؟"

"کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیئے۔"

"میں چٹان اٹھانے میں تمہاری زیادہ مدد نہ کر سکوں گا۔"

"مجھے صرف آپ کی اخلاقی حمایت کی ضرورت ہے۔"

میں جن کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک چٹان کو جو جھیل کے کنارے پڑی تھی، اٹھایا اور اسے پانی میں پھینکنے کے بعد ہانپنے لگا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ فضا میں سینکڑوں فوارے چھوٹے۔

پانی کی لاکھوں بوندیں جب مجھ پر گریں تو یک لخت میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنے بستر پر دراز تھا۔ آس پاس نہ کہیں جن تھا اور نہ الہ دین کا چراغ! البتہ ریڈیو پر کوئی بائی جی . . . . . لہک لہک کر یہ مصرع گا رہی تھیں۔ ؎

خواب تھا جو کچھ تھا دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

مسٹر قریشی

ہمیں وہ دن کل کی طرح یاد ہے جب مسٹر قریشی ہمارے کمرے میں آئے اور یہ مژدہ سنایا "آئیے۔ آپ کا تعارف ایک عظیم ہستی کے ساتھ کرائیں۔"
اس کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے ہم سے فرمایا "وہ عظیم ہستی ہم ہی ہیں۔ وطن بلند شہر ہے۔ جہاں والد محترم ڈپٹی کمشنر ہیں۔ ہم ان کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ ان دنوں آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ چونکہ بھلے آدمی نظر آئے۔ ہم نے مناسب سمجھا آپ سے راہ و رسم پیدا کی جائے۔"

ہم نے رسمی طور پر کہا "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"

مسٹر قریشی ناراض ہو گئے۔ کہنے لگے "رسمی فقروں سے ہمیں چڑ ہے۔ ویسے بھی آپ کو کہنا چاہیئے تھا۔ ہم سے ملاقات کر کے آپ کو ایک ناقابلِ بیان فخر کا احساس ہوا۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"وہ اس لئے" مسٹر قریشی نے اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سوئیں نتالوے اشخاص کے ساتھ گفتگو کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ خاندانی روایات کا تقاضا یہی ہے کہ ہر ایرے غیرے کو منہ نہ لگایا جائے۔"

ہم ان سے مرعوب ہوتے ہوئے بولے "آپ بجا فرماتے ہیں۔"

اُس دن کے بعد مسٹر قریشی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اُن کی وضع قطع اور رہن سہن کے طور طریقوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے فرزند ہیں جن کے خاندان کی بقول اُن کے یوپی میں دھوم ہے۔ لباس نہایت غلیظ پہنتے۔ سر کے بال مہینوں نہ ترشواتے۔ ان کے کمرے میں جتنا فرنیچر تھا وہ کسی کباڑی سے اونے پونے داموں میں خریدا گیا تھا۔ اکثر تنگدست رہتے اور آئے دن پانچ دس روپے قرض لے جاتے جو شاذونادر ہی واپس کرتے۔

مسٹر قریشی جب کبھی اپنے خاندان کا ذکر کرتے یوں معلوم ہوتا چودہ پُشت سے رئیس چلے آرہے ہیں۔ ایک دن بتایا "امسال فصل اچھی نہیں ہوئی زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ کی آمدنی ہوگی"۔ ایک اور دن کہا۔ "والد محترم نے اسّی ہزار کی ایک کار خریدی ہے، لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں۔ کہتے ہیں ہمارے ایسے رئیس کے پاس ایک لاکھ کی کار ہونی چاہیئے"۔

ایک شام کو جب مسٹر قریشی ہوسٹل سے باہر جا رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا ملاقاتی ان سے ملنے کے لئے آیا۔ بات چیت کے دوران پتہ چلا وہ قریشی صاحب کے والد محترم ہیں۔ بلند شہر میں ڈپٹی کمشنر کے کلرک ہیں۔ تھوڑی سی زمین بھی ہے۔ کنبہ کافی بڑا ہے، اسی لئے بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ مسٹر قریشی کے متعلق انہوں نے انکشاف کیا کہ متواتر تین سال سے بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد اب بطور پرائیویٹ امیدوار اسی امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔

جب مسٹر قریشی اپنے کمرے کو لوٹے انھوں نے اپنے والد سے ہمارا تعارف کرانا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد کہا "والد محترم نے بڑی سادہ طبیعت پائی ہے۔ رئیس ابن رئیس ہونے کے باوجود نہایت معمولی لباس پہنتے ہیں"۔ اس پر طرہ یہ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے

ایسا کرنے سے مسافر فطرتِ انسانی کا مطالعہ کر سکتا ہے"۔

ایک اتوار کو مسٹر قریشی نے باتوں باتوں میں ہم سے پوچھا "آپ کو شعر و شاعری سے بھی کچھ شغف ہے؟" جب ہم نے اُن کے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ ایک بیاض نکالی اور کہا۔ "ہماری تازہ غزل سماعت فرمائیے"۔ ترنم سے غزل پڑھنے کے بعد سوال کیا "کیسی ہے؟" غزل واقعی لاجواب تھی۔ ہم نے دل کھول کر داد دی۔ اگلے روز صبح سویرے وہ ہمارے کمرے میں وارد ہوئے اور بولے "کل ایک اور غزل ہو گئی تھی لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے"۔ وہ غزل بھی ہمیں پسند آئی۔ اس کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ مسٹر قریشی دن میں تین تین غزلیں کہنے لگے۔ ان کا گلا کافی سُریلا تھا جب پڑھتے سماں بندھ جاتا۔ بارہا ہمیں ان کی ذہانت پر رشک آیا کہ نوعمر ہونے کے باوجود پختہ فکر ہیں۔ ہم نے سوچا اُن کی امتحان میں ناکامیابی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ طبعاً اور فطرتاً شاعر ہیں۔

ہم نے انھیں مشاعروں میں شرکت کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے فرمایا "مشاعروں سے ہمیں وحشت ہوتی ہے۔ اسّی فیصد سامعین جاہل ہوتے ہیں۔ فضول اشعار پہ داد دیتے ہیں۔ کام کے اشعار پر چپ رہتے ہیں"۔

"اگر مشاعرے ناپسند ہیں تو رسائل کو اپنا کلام بھجوا دیا کیجئے"۔

"انھیں کلام بھجوانا بے سود ہے۔ آج کل ایڈیٹروں کی سخن فہمی کا یہ عالم ہے وہ رباعی اور قطعہ میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ ہمارے کلام کی باریکیاں خاک سمجھیں گے"۔

ایک روز ہم مسٹر قریشی سے اپنی کتاب جو وہ منگا لے گئے تھے۔ لینے کے لئے اُن کے کمرے میں گئے۔ وہ غنودگی کے عالم میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "ہماری الماری میں ہو گی خود ہی نکال لیجئے"۔ کتاب کی تلاش کرتے وقت

اچانک ہماری نظر ایک خوبصورت فائل پر پڑی۔ اُسے کھول کر دیکھا تو وہ کسی گمنام شاعر کا دیوان تھا۔ جس میں وہ تمام غزلیں درج تھیں جنہیں مسٹر قریشی اپنی تخلیقات ثابت کرتے رہے تھے۔

کچھ اور دنوں کے بعد انہوں نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ ہر روز ایک خوبصورت لڑکی کی فوٹو دکھاتے۔ اس کا حسب نسب بیان کرتے۔ پھر پوچھتے اگر ہم اس سے شادی کرلیں، کوئی حرج تو نہیں۔ ان میں کوئی خان بہادر کی لڑکی ہوتی۔ کوئی کسی رئیس اعظم کی دختر نیک اختر ہوتی اور کوئی مشہور فلم ایکٹریس۔ کیونکہ ہر ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب ہوتی، اس لئے وہ فیصلہ نہ کرسکتے کہ کس کو منتخب کیا جائے۔

ایک سہپہر کو جب ہم کالج سے واپس آئے تو شہر کے ایک فوٹو گرافر کو مسٹر قریشی سے تکرار کرتے سُنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ واہ صاحب! یہ بھی خوب رہی۔ دو ماہ ہوئے دوکان سے البم اٹھا لائے کہ ہمیں اپنے رسالہ کے سرورق کے لئے ایک فوٹو کا انتخاب کرنا ہے جس کے لئے آپ کو پانچ سو روپے ادا کریں گے۔ آج تک نہ البم واپس کی نہ یہ بتایا کہ کون سی فوٹو پسند آئی۔"

ہوسٹل چھوڑنے کے بعد کئی سال تک مسٹر قریشی سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن حسنِ اتفاق سے چاندنی چوک میں ان کے ساتھ تصادم ہوگیا۔ ان کے ساتھ ایک دُبلی پتلی اور کالی کلوٹی عورت تھی۔ جس نے دو بچّوں کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے کہنے لگے۔ "بیگم قریشی سے ملئے۔ آپ بجنور کے ایک مشہور جاگیر دار کی اکلوتی صاحبزادی اور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔" ہم آداب بجالائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتے لگیں۔ بیگم قریشی کے لب ولہجہ کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تو کجا وہ مڈل پاس بھی نہیں معلوم ہوتیں قریشی صاحب سے یہ دریافت کرنے پر کہ ان کا کیا شغل ہے معلوم ہوا وہ "بے نظیر سرکس"

کے مالک ہیں جس سے انہیں بیس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہوتی ہے۔

گزشتہ سال ہمیں متھرا جانے کا اتفاق ہوا۔ شہر کی دیواروں پر "بے نظیر سرکس" کے اشتہارات چسپاں دیکھ کر ہمیں مسٹر قریشی کا خیال آیا۔ سوچا آج رات سرکس دیکھا اور ان سے ملاقات کی جائے۔ جونہی پنڈال میں داخل ہوئے طبیعت بشاش ہوگئی۔ واقعی یہ سرکس اسم بامسمیٰ تھا کھیل شروع ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد دو جوکر اکھاڑے میں اترے۔ اُن میں سے ایک پر ہمیں مسٹر قریشی کا گمان ہوا اور جب اُس نے اپنے ساتھی کے منہ پر تھپیڑ لگا کر فضول سا فقرہ کسا تو گمان یقین میں تبدیل ہوگیا۔ بڑی حیرانی ہوئی کہ مسٹر قریشی کو یہ کیا سوجھی۔ کھیل کے اختتام پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "آج ایک جوکر بیمار ہوگیا تھا۔ ہم نے سوچا حاضرین کو بڑی مایوسی ہوگی، اس لئے خود جوکر کا پارٹ ادا کرکے اس کمی کی تلافی کردی۔" یہ کہنے کے بعد انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہمارے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھا "کہئے ہماری اداکاری کیسی رہی؟" ہم نے ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے جواب دیا "مسٹر قریشی! آپ تو پیدائشی اداکار ہیں۔ آپ ہمیشہ اداکاری کرتے رہے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہ بناوٹ پر حقیقت کا گمان ہوتا رہا ہے۔"

راشی پھل

اگر ہم عرض کریں، ہم نے رسائل کا وہ صفحہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے جس کا عنوان ہوتا ہے "راشی پھل" اور جس پر مختلف راشیوں کا پھل تحریر کیا جاتا ہے، تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔ آپ کہیں گے اشتہاروں کے علاوہ وہی صفحہ تو پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔ بلکہ بیشتر قارئین رسالہ خریدتے ہی اس لئے ہیں کہ اپنا راشی پھل پڑھ سکیں۔ ورنہ آج کل رسائل میں ہوتا ہی کیا ہے۔ دو ایک اوٹ پٹانگ جدید نظمیں، تین چار غیر دلچسپ کہانیاں اور چار پانچ خشک اور فضول مضامین!

آج سے سات ماہ پہلے ہم بھی آپ کی طرح سوچتے تھے اور بہت شوق سے اپنا راشی پھل پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کالم کے مصنف ایک ممتاز راج جیوتشی تھے جنہوں نے ہر ملک کے وزیر اعظم کی وفات کی پیش گوئی کی تھی۔ ان میں سے کم از کم دو اس تاریخ کے آس پاس اللہ کو پیارے ہو گئے تھے جو راج جیوتشی نے بتائی تھی۔ یوں تو راج جیوتشی پیش گوئی نہ بھی کرتے ان کے بچنے کی امید کم تھی۔ کیونکہ ان میں سے ایک پر فالج گرا تھا اور دوسرا بڑی مدت سے دمہ میں مبتلا تھا۔ اور سردی سخت پڑ رہی تھی۔

سات ماہ پہلے اپنا راشی پھل پڑھنے کے بعد ہم نے اسے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا، اس کی کئی وجوہ ہیں۔ چار مہینے کا ذکر ہے، ہمیں ایک اعلیٰ ملازمت کیلئے

دہلی سے دعوت نامہ آیا۔ ہم ٹکٹ لے کر دہلی جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ اتنے میں ایک اخبار فروش نے ایک رسالہ کی تعریف کرتے ہوئے اصرار کیا کہ ہم اسے خرید لیں۔ رسالہ خریدنے کے بعد ہم نے فوراً راشی پھل والا صفحہ نکالا۔ ہماری راشی 'کرک' کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی ـــــ سفر ہرگز نہ کریں کسی حادثے میں سخت چوٹ لگنے یا جان جانے کا احتمال ہے۔ ہم یہ پیشین گوئی پڑھ کر اتنے خوف زدہ ہوئے کر اُسی وقت بس سے اتر کر گھر چلے آئے بیگم نے گھبرا کر پوچھا "خیر تو ہے۔ آپ دہلی کیوں نہیں گئے؟"

ہم نے جواب دیا۔ "بھگوان! آج تو بال بال بچ گئے۔"

اُس نے اور بھی گھبرا کر سوال کیا۔ "بات کیا ہوئی؟"

"بات ہوئی نہیں۔ ہونے والی تھی۔"

"آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔"

ہم نے اُسے راشی پھل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "اگر ہم آج سفر کرنے کا خطرہ مول لیتے تو چند گھنٹوں کے بعد اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں! راج جیوتشی کا قول کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔ آپ ابھی شام کو سن لیں گی کہ جس بس میں ہم سفر کرنا چاہتے تھے اس کی ایک ملٹری ٹرک کے ساتھ خوف ناک ٹکر ہوئی۔ آدھے مسافر جاں بحق ہو گئے۔ آدھے سخت زخمی ہوئے۔ اُن میں سے دو ایک کی حالت نازک ہے!"

بیگم صاحبہ جو دہلی جانے کا خواب دیکھ رہی تھیں، کچھ مایوس سی ہو گئیں۔ ہم نے اُن کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "یہ تو اچھا ہی ہوا جو ہم نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ورنہ آپ ہی کہتیں۔ اچھے گئے تھے دہلی۔ زخمی ہو کر آئے یا یہاں سے تو صحیح سلامت گئے تھے، لیکن واپس نعش آئی۔"

دوسرے دن ہم نے اخباروں میں اُس خبر کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کی سرخی ہو ـــــ دہلی جانے والی بس اور طرک میں خوفناک ٹکر! لیکن ہمیں کسی اخبار میں ایسی خبر نہ ملی۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہم نے اپنے راشی پھل میں پڑھا: "اچانک کہیں سے روپیہ ملے گا!" ہم بہت خوش ہوئے۔ معاً ہمیں اُن احباب کا خیال آیا جو ہم سے قرض لینے کے بعد کچھ اس طرح غائب ہو گئے تھے کہ ان کے بارے میں "گمشدہ احباب کی تلاش" کے عنوان سے اشتہار دینے کو جی چاہتا تھا۔ ہم نے سوچا اُن میں سے کسی کے ضمیر نے اُسے جھنجوڑا ہوگا۔ بھلے مانس اتنے دن ہو گئے تو قرض ادا کیوں نہیں کرتا۔ وہ بھاگم بھاگ ہمارے پاس آئے گا اور معذرت کرنے کے بعد کہے گا۔ بہت شرمندہ ہوں۔ یہ رہے آپ کے پانچ سو روپے! میرے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ اس سے پہلے میں آپ کا قرض چکا نہ سکا۔ سارا دن ہم کسی ایسے دوست کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ شام تک نہ آیا۔ ہم نے بیگم سے کہا: "اب کہیں سے تار آئے گا۔ ہمارا فلاں رشتہ دار چل بسا اور اُس نے وصیت میں پانچ ہزار روپے ہمارے لئے وقف کئے۔" جب تار بھی نہ آیا تو غم غلط کرنے کے لئے سینما دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ جب ٹکٹ لے رہے تھے کسی ہوشیار جیب کترے نے ...... ہمارا بٹوہ اُڑا لیا۔ اُس میں پانچ سو کے نوٹ تھے!

اُس سے اگلے ہفتے ہمارا راشی پھل اس طرح تھا: "افسر مہربان ہوں گے۔ ممکن ہے اگلا گریڈ بھی مل جائے۔" ہم یہ خوشخبری پڑھ کر پچھلی باتیں بھول گئے۔ ہمیں خیال آیا۔ اگر اگلا گریڈ مل جائے تو زندگی ٹھاٹھ سے بسر ہوگی۔ دس سال سے سینئر کلرک چلے آ رہے ہیں۔ اب سپرنٹنڈنٹ کہلائیں گے۔ ہم اُس مبارک ساعت کا انتظار

کرنے لگے، جب صاحب اپنے دفتر میں بلوا کر یہ مژدہ سنائیں گے۔ چار بجے کے قریب انہوں نے بلوا بھیجا اور ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ اُس پر جو لکھا تھا اُسے پڑھ کر ہمارے ہوش اُڑ گئے ــــــ "پچھلے دو سال سے آپ کا کام غیر تسلی بخش ہے۔ آپ کو کئی بار تنبیہہ کی جا چکی ہے، لیکن آپ نے پرواہ نہیں کی۔ آج سے آپ کو جونیئر کلارک بنایا جاتا ہے۔ آپ کل اپنا چارج مسٹر بھیکم داس کو دیدیں!"

ان تین واقعات کے بعد ہمیں شک سا ہونے لگا۔ کہیں راج جیوتشی جی ہمارا مذاق تو نہیں اُڑا رہے ہیں۔ وہ جو بھی پیش گوئی ہمارے بارے میں کرتے ہیں، غلط ثابت ہوتی ہے۔ ہم نے انھیں رسالہ کے مدیر کی معرفت خط لکھا جس میں اُن سے دریافت کیا، "لوگوں کو خواہ مخواہ ڈرانے یا سبز باغ دکھانے میں آپ کو لطف آتا ہے کیا؟ اگر آپ کو جیوتش کا علم نہیں آتا تو کوئی اور دھندا کیوں نہیں کر لیتے؟" چار پانچ دن کے بعد اُن کا خط آیا۔ آپ تین باتیں یعنی اپنے دل پسند پھول کا نام، اپنی تاریخ پیدائش اور خط لکھنے کا صحیح وقت ایک کاغذ پر لکھ کر پانچ روپے کے پوسٹل آرڈر کے ساتھ بھجوا دیجئے۔ پھر ہم آپ کو بتا سکیں گے آپ کا راشی پھل ہمیشہ اُلٹا کیوں آتا ہے۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے لکھ بھیجا۔ "آپ سے سنیچر خفا ہے اُسے منانے کا اُپائے یہ ہے۔ سات لاکھ سات ہزار سات سو سات بار گائتری منتر کا جاپ کریں۔ تین ماہ تک ہر سنیچر وار کالے ناگ کو دودھ پلائیں یا کالے کتے کو میٹھی روٹی کھلائیں!"

اُن کے بتائے ہوئے اُپایوں پر جب غور کیا تو پہلے دو اُپائے مشکل نظر آئے سات لاکھ سات ہزار سات سو سات بار گائتری منتر کا جاپ کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ کالے ناگ کو دودھ پلانے میں تین مشکلیں تھیں۔ اوّل دودھ بہت مہنگا تھا ہم خود نہیں پی سکتے تھے اُسے کیسے پلاتے۔ دوم ہم نے اکثر پڑھا تھا کالے

ناگ کو دودھ پلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے تو صرف اس کے زہر میں اضافہ ہوگا۔ سوم کالے ناگ بہت مشکل سے ملتے ہیں اور مل جائیں تو انھیں دیکھ کر روح فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کالے کتے کو میٹھی روٹی کھلایا کریں گے۔ روٹی دودھ کے مقابلے میں سستی بھی رہے گی۔

جب پہلا سنیچر وار آیا، ہم ایک میٹھی روٹی لے کر کالے کتے کی تلاش میں چل دیئے۔ گلیوں اور بازاروں میں کئی کتے ملے لیکن ان میں کالے رنگ کا کتا نظر نہ آیا۔ ہم بہت مایوس ہوئے۔ ایک دوست کے گھر پہنچے جسے کتے پالنے کا شوق تھا۔ بدقسمتی سے اس کے تمام کتوں کا رنگ بھورا یا خاکی تھا۔ ہم گھر لوٹ رہے تھے۔ راستے میں ایک فقیر نے جو کالا بھجنگ تھا، روٹی کا سوال کیا۔ ہم نے یہ سوچتے ہوئے کہ راج جیوتشی نے اپنے خط میں کالے فقیر کا ذکر نہیں کیا۔ اُسے روٹی دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے اگلے سنیچر وار ایک شخص نے بتایا شہر کے سارے کالے کتوں کو میونسپلٹی نے مروا دیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے دو ایک باؤلے ہو گئے تھے۔ میونسپل کمیٹی کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ اگر انہیں تین مہینے زندہ رہنے دیا جاتا تو ہم اُپائے کا پروگرام پورا کر لیتے۔

ہم نے محسوس کیا کالے کتے کی تلاش میں کسی اور شہر میں جانا پڑے گا۔ روٹھے سنیچر کو منانے کے لئے ہم نے یہ بھی گوارا کر لیا۔ ایک سنیچر وار کو ہم نے ایک قصبے کا رُخ کیا۔ ابھی وہ دو فرلانگ رہا ہوگا کہ ہماری نظر ایک کالے کتے پر پڑی۔ وہ بے تحاشا ایک تالاب کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ ہم نے اُسے زور سے پکارا۔ وہ ہماری طرف دوڑ کر آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اُسے میٹھی روٹی پیش کرتے۔ اُس نے ہماری دائیں ٹانگ دبوچ لی۔ ہماری چیخ و پکار کے

باوجود ہمیں تین چار جگہ کاٹ کھایا اور پھر تالاب کی طرف بھاگ گیا۔ ہم درد سے کراہنے لگے ۔ اتنے میں ایک راہگیر نے بتایا یہ کتا باؤلا ہے اور تین چار آدمیوں کو پہلے بھی کاٹ چکا ہے ۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا کہ اسپتال میں جاکر ٹیکے لگوائیے۔

اسپتال میں ڈاکٹر نے بتایا مکمل کورس چودہ ٹیکوں کا ہے اور یہ ٹیکے پیٹ میں لگائے جاتے ہیں ۔ ہم ٹیکوں سے تھوڑا نہیں بہت گھبراتے ہیں، اس لئے ڈرتے ڈرتے پوچھا " اگر ٹیکے نہ لگوائے جائیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" آپ کو ہائیڈروفوبیا ہوجائے گا ۔ اس مرض میں آدمی پانی سے ڈرتا ہے کُتے کی طرح بھونکتا ہے اور آخر سر ٹپک ٹپک کر مر جاتا ہے ! "

ہم ٹیکے لگوانے پر رضامند ہوگئے ، لیکن جب اُس نے پہلا ٹیکہ لگانے کے لئے دوا سرنج میں بھری ، اُسے دیکھ کر ہم پر کپکپی طاری ہوگئی ۔ ڈاکٹر تسلّی دیتے ہوئے بولا ۔" گھبرائیے نہیں معمولی درد ہوتا ہے جسے برداشت کیا جاسکتا ہے ۔"

ٹیکہ لگواتے وقت اور اس کے بعد اتنا درد ہوا کہ ہم نے آسمان سر پر اٹھا لیا یہ سوچ کر کہ ابھی تیرہ ٹیکے اور لگیں گے ، ہمارے اوسان خطا ہوگئے ۔

چودھواں ٹیکہ لگوانے کے بعد ہم اسپتال سے گھر آرہے تھے ۔ گلی کے نکڑ پر ہم نے ایک فقیر کو اقبال کی مشہور غزل گاتے ہوئے سُنا ۔ وہ لہک لہک کر گا رہا تھا ـــــــ

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے

ہمارے جی میں آیا ، اُس سے کہیں ، ـــــــ " ہم مجنوں ہیں نہ اقبال ۔ شہر چھوڑ سکتے ہیں نہ صحرا ۔ لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں آج سے ہم نے رسائل کا وہ صفحہ پڑھنا چھوڑ دیا جس کا عنوان ہوتا ہے ' راستی پھل ! ' "

خواجہ عیّار

"یہ سب اساتذہ کا فیضان ہے ورنہ من آنم کہ من دانم!" خواجہ عیّار نے مجھے بتایا۔ میں اُن سے ایک مشہور ادبی رسالہ کے لئے انٹرویو لے رہا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے اسکول اور کالج میں جو کچھ اساتذہ نے آپ کو پڑھایا ہے اسی کی بدولت آپ نے زندگی میں کامیابی اور ہر دلعزیزی حاصل کی ہے؟"

"جی نہیں۔ اسکول ماسٹر اور پروفیسر زیادہ سے زیادہ الجبرا کے فارمولے پڑھا سکتے ہیں، یا یہ بتا سکتے ہیں کہ تاریخ انگلستان میں کتنے جارج اور کتنے ایڈورڈ ہوئے ہیں۔ جہاں تک دنیاداری کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ساری عمر اسکول ماسٹر اور پروفیسر ہی رہتے ہیں۔"

"تو پھر آپ کی اساتذہ سے کیا مراد ہے؟"

"دیکھئے۔ زمانہ قدیم میں ایک رشی دتاتریہ ہوئے ہیں کہتے ہیں ان کے ایک سو گرو تھے ——— لطف یہ کہ بلّی سے لے کر ببر تک ہر جانور اور پدّی سے لے کر عقاب تک ہر پرندہ ان کا گرو تھا۔ کیونکہ بقول ان کے انہوں نے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا۔"

"بہت خوب! تو آپ نے رشی دتاتریہ کی طرح پرندوں اور جانوروں کو اپنا استاد بنایا۔"

"آپ میرا مطلب غلط سمجھے۔ پرندوں اور جانوروں کو نہیں۔ گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسانوں کو ہم نے . . . . ."

"کیا آپ اپنے اساتذہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟"

"جی ہاں میرے ایک استاد حاجی صاحب ہیں۔ انہوں نے مجھے دو نایاب نسخے بتائے۔ پہلا یہ کہ ایک نا واقف کو جھک کر سلام کرنے کے بعد اس کا مزاج پوچھو۔ جب وہ حیرت کا اظہار کرے تو اس سے اپنا تعارف کراتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے کہو آپ کی بہت تعریف سنی تھی۔ مدت سے آرزو تھی۔ آپ سے شرفِ نیاز حاصل کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے آج وہ مراد بر آئی" اس نسخے پر عمل کرنے سے آپ کے دائرہ واقفیت میں اضافہ ہوگا اور لوگ آپ کو بہت نیک، حلیم اور ملنسار سمجھنے لگیں گے۔

حاجی صاحب نے دوسرا گُر یہ بتایا، جب کوئی شخص آپ سے مشورہ طلب کرے تو یہ پتہ چلانے کی کوشش کیجئے کہ وہ خود کیا چاہتا ہے؟ اس کے بعد اس کے فیصلہ کی زوردار الفاظ میں تائید کر دیجئے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کہے کہ پروفیسری کے پیشے سے تنگ آگیا ہے اور چاٹ کی دوکان کھولنا چاہتا ہے تو فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہئے۔ جی ہاں۔ چاٹ کا دھندا بہت اچھا رہے گا۔ دو چار سال میں وارے نیارے ہو جائیں گے، لیکن اگر وہ دو ایک منٹ کے بعد اپنے نظریے میں ترمیم کرتے ہوئے کہے، لیکن یہ کوئی معزز پیشہ نہیں، تو آپ کے لئے یہ کہنا واجب ہوگا ہاں صاحب پروفیسری آخر پروفیسری ہے! کیا بات ہے اس پیشے کی! چاٹ بیچنے والوں کو ان کے سوا کون پوچھتا ہے۔"

"بہت خوب! حاجی صاحب واقعی بہت پہنچے ہوئے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔ اسی طرح ایک اور پہنچے ہوئے بزرگ دیوان صاحب ہیں۔"

"اُن سے آپ نے کیا سیکھا؟"

"بہت کچھ! اُن کی تو ہر بات موتیوں میں تولنے کے قابل ہوتی ہے۔ مثلاً اسی کو لیجئے وہ اپنے ہر تنگدست دوست سے وقت بے وقت روپیہ مستعار لینے کی درخواست کرتے رہتے ہیں"۔

"اس سے انھیں کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

"یہ کہ کوئی تنگدست ان سے قرض مانگنے کے لئے نہیں آتا۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ دیوان بھی ہماری طرح تنگدست ہیں۔ اس طرح وہ مالی نقصان سے صاف بچ جاتے ہیں۔ جو ایک انسان کو اکثر اس لئے اٹھانا پڑتا ہے کہ اس کے دوست قرض لینے کے بعد واپس نہیں کرتے"۔

دیوان صاحب کا ایک اور سنہرا اصول یہ ہے کہ جب اُن کا کوئی دوست یا رشتہ دار اُن کے ہاں بطور مہمان آنے کا ارادہ کرتا ہے وہ اُسے بواپسی ڈاک لکھ بھیجتے ہیں۔ "مجھے آپ کا خیر مقدم کر کے بہت مسرّت ہوتی، لیکن افسوس اُنہی دنوں بمبئی جا رہا ہوں"۔ اگر اس حوصلہ شکن جواب کے باوجود کوئی ڈھیٹ مہمان اُن کے یہاں آ دھمکتا ہے تو پھر وہ اُسے بھگانے کے لئے دو تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کی تواضع ایسے کھانے سے کرتے ہیں جس کی تاب صابر سے صابر مہمان دو دن سے زیادہ نہیں لا سکتا! اگر لنچ کے وقت اُسے بینگن کی بھاجی، بینگن کے کوفتے، بینگن کا بھرتہ اور بینگن کا رائتہ پیش کیا جاتا ہے تو ڈنر کدّو کی بھاجی کدّو کے کوفتے، کدّو کا بھرتا اور کدّو کے رائتے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سلوک کے باوجود اگر وہ سخت جان ثابت ہو تو وہ اپنے اُن سارے احباب کو مدعو کر لینے

ہیں جو پرلے درجے کے بور ہیں۔ انھیں مہمان کے پاس بٹھا کر خود کھسک جاتے ہیں۔ وہ سب مہمان کا دماغ کچھ اس بے دردی سے چاٹنے لگتے ہیں کہ بے چارے کو وہاں سے بھاگتے ہی بنتی ہے۔"

"دیوان صاحب واقعی کمال کے آدمی ہیں۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن مرزا صاحب بھی دیوان صاحب سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔"

"مرزا صاحب سے آپ نے کیا سیکھا؟"

"مرزا صاحب کا عقیدہ ہے، کسی شخص کی مدد کرنے سے پہلے یہ پوچھنا چاہیئے میں اس کی مدد کروں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں اس کی مدد نہ کروں تو مجھے کیا نقصان ہوگا؟ جواب دونوں حالتوں میں صفر ہو تو ہرگز مدد نہ کرنی چاہیئے۔ مرزا صاحب اس اصول پر اتنی سختی سے عمل کرتے ہیں کہ آج تک انہوں نے کسی دوست کے جنازے کو کندھا نہ دیا۔ کسی یتیم کے آنسو نہ پونچھے۔ کسی بیوہ کی ڈھارس نہ بندھائی۔ صرف ایک بار انہیں یہ اصول توڑنا پڑا۔ جس کا انھیں عمر بھر افسوس رہے گا۔ ایک دن اُن کے ہمسائے کے بچے کے حلق میں پانچ پیسے کا سکہ اٹک گیا اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ ہمسائے نے انھیں ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنے کے لئے کہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر سکہ حلق سے نکال لیا گیا، انھیں کچھ نہ ملے گا اور اگر دم گھٹنے سے بچے کی موت ہوگئی تو انھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ مرزا صاحب نے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر دیا۔"

"اس کے علاوہ مرزا صاحب نے آپ کو کیا سکھایا؟"

"یہ کہ کام حرام ہے کے مقولے پر عمل کرنا چاہیئے، لیکن اپنے افسر کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی کارگزاری کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹتے رہنا چاہیئے بلکہ صاحب

میں دفتر سے سات بجے شام گھر گیا۔ پرسوں آٹھ بجے گیا تھا۔ گھر پر ایک بجے تک دفتر کا کام کرتا رہا، لیکن وہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ادھر آپ چاہتے ہیں کوئی فائل پینڈنگ نہ رہے۔ حضور اگر دو نہیں تو ایک اسسٹنٹ تو دلوا دیجئے۔ نہیں تو بخدا مر جاؤں گا۔"

"مرزا صاحب کے علاوہ آپ کے اور کتنے اُستاد ہیں؟"

"اُستاد تو کئی ہیں، لیکن صرف چیدہ چیدہ کا ذکر کروں گا۔ خان صاحب کو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ وہی جو زبیس اعظم کہلاتے ہیں۔ اُن سے ہم نے بہت سی کارآمد باتیں سیکھیں۔ مثلاً ایک بار اُنھوں نے فرمایا 'وہ شخص واقعی بہت سادہ لوح ہے جو دوسروں کو بے وقوف نہیں سمجھتا، اُن کا مطلب تھا اپنی فضیلت قائم رکھنے کے لئے بڑے سے بڑے دانشمند کو خاطر میں نہ لانا چاہیئے۔ اُس میں دو ایک نقائص نکال کر ثابت کرنا چاہیئے کہ اس جیسا جاہل انسان شاید ہی کوئی ہو گا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں چاہے کوئی شخص کتنی ہی دور کی کوڑی لائے۔ اُسے زِچ کرنے کے لئے فوراً کہنا چاہیئے 'صاحب! یہ تو بہت فرسودہ بات ہے۔ آج سے چھبیس سو برس پہلے افلاطون نے کہی تھی'۔ اگر وہ بحث پر اُتر آئے اور اعتراض کرے 'افلاطون نے یہ بات ہرگز نہیں کہی'۔ تو اُسے بتانا چاہیئے سقراط یا ارسطو نے کہی ہو گی۔

ہمارے ایک اور استاد پنڈت جی ہیں اُن سے ہم نے چندہ مانگنے والوں کو ٹالنے کا گر سیکھا۔ اُن سے جب کوئی شخص چندے کی درخواست کرتا ہے، وہ جھٹ معقول رقم دینے کا وعدہ کر لیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی لگا دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کا نمبر آنے پر آپ کو چندہ ملے گا۔ اب آپ حشر تک انتظار کرتے رہئیے آپ کا نمبر نہ آئے گا۔ اُنہی سے ہم نے کام نکالنے کا آرٹ

سکھا۔ اُنھیں جب کسی شخص سے کام پڑتا ہے تو اُس کے داماد کو گھبر گھار کر اُس کے پاس بھجوا دیتے ہیں اور جب سے اُس سے ہاں نہیں کہلوا لیتے، داماد کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

یہاں ایک اور استاد کا ذکر بھی لازم ہے۔ آپ ہیں آغا صاحب۔ آپ تنقید نگار ہیں یا اپنے کو تنقید نگار سمجھتے ہیں۔ آپ کا اصول ہے کسی ادیب کی تعریف نہ کرنی چاہیئے۔ نہیں تو وہ خواہ مخواہ اکڑ جاتا ہے۔ جب کسی ادبی تخلیق غزل یا نظم پر ان کی رائے دریافت کی جاتی ہے تو منہ بنا کر کہتے ہیں "ہاں بری نہیں لیکن اگر شاعر اس کی نوک پلک سنوارنے کی مزید کوشش کرے تو بہتر ہو سکتی ہے۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا "تاج محل کے متعلق کیا خیال ہے؟ فرمایا "اتنا خوبصورت تو نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ ہاں اگر شاہجہاں تھوڑی سی دماغ سوزی اور کر لیتا تو اس سے بہتر تاج محل کی تخلیق کر سکتا تھا۔ ایک مجلس میں دیوان غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے "میری رائے میں اگر مرزا غالب اپنے منتخب کلام کا ایک بار اور انتخاب کرتے تو ان کا دیوان بہتر ہو سکتا تھا"۔

آغا صاحب سمجھتے ہیں شعراء کو ذلیل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ چاہے وہ کتنا زور ماریں اُن سے کہا جائے ع

"نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب!"

"آپ نے ابھی تک چھ اُستادوں کا ذکر کیا۔ آپ کے اور اُستاد بھی تو ہوں گے؟"

"جی ہاں۔ وہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ان چھ کے ارشادات پر عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کامیابی آپ کے قدم نہ چومے۔ باقی اُستادوں کے متعلق میں اس لئے کچھ نہ کہوں گا کہ میرے ایک اُستاد کا قول ہے کہ کچھ راز ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی کو بتائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے معذرت چاہتا ہوں"۔

نسخہ

آزاد پارک میں ایک مجمع باز نے بہت بھیڑ اکٹھی کر رکھی تھی۔ وہ ایک اسٹول پر کھڑا تھا اور اس نے اپنے دائیں اور بائیں اُگے ہوئے دو پودوں پر کچھ تصویریں لٹکا رکھی تھیں۔ مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے کہا "میرے معزز دوستو! میں حکیم ہوں نہ مداری۔ میں جادوگر بھی نہیں۔ میرے پاس گنجی چاند پر بال اُگانے کا کوئی نسخہ نہیں۔ اصل میں اگر آدمی ایک بار گنجا ہو جائے اس کے سر پر کبھی بال نہیں اُگتے جیسے بنجر زمین میں گھاس نہیں اُگتی۔ میں آپ کو جادو کا بھی کوئی کھیل نہیں دکھاؤں گا کیونکہ جسے عرفِ عام میں جادو کہا جاتا ہے وہ محض ہاتھ کی صفائی ہے۔ جادوگر کا کمال ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ ناظرین کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ میں کسی مداری کی طرح بڑے بوڑھوں کی داڑھیوں میں سے انڈے برآمد نہیں کروں گا۔ میری رائے میں ایسا کرنا پرلے درجہ کی بدتمیزی ہے۔ میرے بیگ میں کالی کھانسی، تپِ دق یا یرقان کی کوئی دوا نہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی شخص ان نامراد امراض میں مبتلا ہے تو اسے کسی لائق ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنا چاہیئے۔

مجمع میں سے کسی شخص نے پوچھا "پھر تم پارک میں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اتنا ہجوم کس لئے اکٹھا کر رکھا ہے؟"

مجمع باز نے جواب دیا "میں اسی موضوع کی طرف آ رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے

تجھ سے یہ سوال کیا۔ معززِ دوستو! میرے پاس ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ یہ مجھے کسی سادھو، سنیاسی یا جوگی سے نہیں ملا۔ یہ میری اپنی ایجاد ہے۔ اس نسخے کا پرچار کرنے کے لئے میں ہر شہر میں وارد ہوتا ہوں، لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور یہ دنیا بہت وسیع ہے۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ چھ بجے میں آپ کے شہر سے چلا جاؤں گا اور پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میرا جوگی والا پھیرا ہے۔"

کسی اور شخص نے دریافت کیا۔ "آخر تمہارے پاس کس چیز کا نسخہ ہے؟"

مجمع باز بولا۔ "میں اسی موضوع کی طرف ہی آرہا تھا۔ معززِ دوستو! کان کھول کر سن لیجئے میرے پاس لڑاکا اور جھگڑالو بیوی کو ٹھیک کرنے کا نسخہ ہے۔" سب لوگ ہنسنے لگے۔ مجمع باز نے نہایت سنجیدگی سے کہا "آپ ہنس رہے ہیں۔ خدانخواستہ آپ کا واسطہ کسی بدمزاج، سڑیل اور بدزبان بیوی سے پڑجائے تو پھر آپ خون کے آنسو روئیں گے۔ یہ دیکھئے میرے دائیں طرف ایک تصویر ٹنگی ہے۔ یہ ایک مشہور پروفیسر کی تصویر ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ پچھلے دنوں اس نے خودکشی کرلی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا ابھی ابھی بیاہ ہوا تھا۔ بدقسمتی سے اسے بڑی لڑاکا اور بدمزاج بیوی ملی۔ جس نے رات دن اس کی جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ وہ زندگی سے تنگ آگیا۔ اس نے سوچا ایسی زندگی سے موت بدرجہا اچھی ہے۔ معززِ دوستو! اندازہ لگاکر دیکھا گیا ہے کہ سو میں سے اٹھاون شوہر اس لئے خودکشی کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بیویاں لڑاکا ہوتی ہیں۔ جن میں خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی وہ پاگل ہوجاتے ہیں۔ اب ذرا میری بائیں طرف ٹنگی ہوئی تصویر کو دیکھئے یہ ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ستائیس برس کی عمر میں تپ دق میں مبتلا ہوگیا۔ وجہ؟ اس کی بیوی ہر روز اُسے سخت وسست کہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ آخر وہ بمبئی کے سول اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا۔ افسوس کتنا

دردناک انجام ہوا اس نوجوان کا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ لڑاکا بیوی دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔"

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ مجمع باز نے تیسری تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تصویر بنارس کے ایک سیٹھ کی ہے۔ آج کل وہ رانچی کے پاگل خانے میں ہے اور ہر وقت "شکنتلا پر خدا کی لعنت ــــ شکنتلا پر خدا کی لعنت" کی رٹ لگاتا ہے۔ شکنتلا اس کی بیوی کا نام ہے۔ معزز دوستو! کہتے ہیں، عشق نے ہزاروں گھر تباہ کئے۔ یقیناً تو یوں ہی بدنام ہے۔ عشق سے کہیں زیادہ گھر لڑاکا بیویوں نے تباہ کئے۔ انہوں نے تو نامور ادیبوں کو بھی معاف نہیں کیا آپ نے روسی مصنف ٹالسٹائی کی بدمزاج بیوی کا قصہ ضرور سنا ہوگا۔ ٹالسٹائی اپنے ناول کا ایک باب مکمل کر رہا تھا کہ اتنے میں وہ چائے لائی اور چلا کر کہنے لگی۔ "پہلے چائے پی لو۔ پھر لکھتے رہنا" ٹالسٹائی نے جواب دیا "ایک منٹ ٹھہرو۔" بیوی کو جو غصہ آیا تو اس نے گرم چائے ٹالسٹائی پر انڈیل دی۔ بیچارے ٹالسٹائی نے پھر بھی مسکرا کر کہا "میں جانتا تھا کہ بادل گرج رہا ہے ضرور برسے گا۔" انگریز شاعر ڈرائیڈن کی بیوی اتنی بدزبان تھی کہ جب اس کی وفات ہوئی تو ڈرائیڈن نے اس کی قبر پر یہ الفاظ کندہ کرائے: "یہاں مسز ڈرائیڈن آرام کر رہی ہے اور اس کی موت کے بعد اس کا شوہر بھی آرام کر رہا ہے۔"

میرے معزز دوستو! اگر آپ میں سے کسی بدنصیب کے پلے اس قسم کی بیوی پڑی ہے۔ تو گھبرائیے نہیں، پاگل ہونے کی یا خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف ایک روپیہ صرف کر کے یہ نسخہ خرید سکتے ہیں۔ خیال فرمائیے۔ ایک روپیہ کیا چیز ہے اس مسرت اور سکون کے مقابلے میں۔ جو آپ کو اپنی لڑاکا بیوی کو راہِ راست پر لا کر حاصل ہوگا۔ دیکھئے۔ جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ خوش مزاج بیوی تو اتفاق سے ملتی ہے۔ وہ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ آپ نے غالب کا اپنی بیوی کے متعلق

لطیفہ سُنا ہوگا۔ اس کا نام امراؤ بیگم تھا۔ ایک دن وہ ایک نیا مکان دیکھنے گئی۔ غالب نے پوچھا "پسند آیا نیا مکان؟" اس نے جواب دیا "مکان تو اچھا ہے، لیکن سنا ہے اس میں ایک بلا رہتی ہے۔" غالب نے تبصرہ کیا "دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے؟" ہاں صاحب میں نسخے کا ذکر کر رہا تھا جس شخص کو ضرورت ہو آواز دے، کر خرید سکتا ہے۔ یہ نسخہ ایک لفافے میں بند ہے اسے گھر جا کر پڑھنا ہوگا، لیکن کسی شخص سے ذکر نہ کیجیئے گا کہ اس میں کیا لکھا ہے ورنہ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔

ایک نوجوان نے نسخہ خریدنے کے لئے آواز دی۔ باقی لوگ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ مجمع باز نے کہا "میں اس نوجوان کی اخلاقی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ اس نے جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے نسخہ خریدا ہے۔ معزز دوستو! میں یہاں صرف پندرہ منٹ اور ٹھہروں گا۔ جسے نسخے کی ضرورت ہے فوراً خرید لے۔ پھر یہ نسخہ کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوگا۔

بیس پچیس اشخاص نے نسخہ خرید لیا۔ مجمع باز نے پودوں سے تصویریں اتاریں اور چلتا بنا۔ جس نوجوان نے سب سے پہلے نسخہ خریدا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر پہنچا تاکہ لفافہ کھول کر نسخہ پڑھے۔ لفافے میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "بڑا کا بیوی کو سیدھی راہ پر لانے کے لئے صرف تین ترکیبیں ہیں۔ پہلی: ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملائیے چاہے وہ فضول اور بے تکی بات کرے۔ آپ ہمیشہ کہئے جزاک اللہ۔ بجا فرمایا آپ نے ——— اگر یہ گر کارگر ثابت نہ ہو اور وہ بدزبانی پر اتر آئے تو آپ ایسی ایکٹنگ کیجئے جیسے آپ پر بے ہوشی طاری ہوا چاہتی ہے۔ دو ایک منٹ کے بعد دھڑام سے فرش پر گر پڑیئے جیسے واقعی آپ بیہوش ہو گئے ہیں۔ اگر یہ ترکیب بھی بے کار ثابت ہو تو پھر چپکے سے گھر سے بھاگ جائیے اور اس وقت تک گھر واپس نہ آئیے جب تک وہ اخباروں میں اعلان نہ کرے کہ اس نے بدزبانی اور بدمزاجی سے توبہ کر لی ہے۔ اور آئندہ کبھی آپ کو تنگ نہیں کرے گی۔

فتنہ بٹالوی

روایت ہے جب مرزا محمد رفیع سوداؔ کسی شخص سے بگڑتے تو فوراً پکارتے "ارے غنچہ! لانا قلمدان۔ ذرا اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے" یہ اسی قلمدان کا نتیجہ تھا کہ عالم، جاہل، فقیر امیر، نیک بد کسی کی عزت ان کے ہاتھ سے نہیں بچی۔ اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے میاں غنچہ کے انتقال کے بعد یہ قلمدان جناب فتنہ بٹالوی کے ہاتھ لگ گیا۔ آپ ہجو تو نہیں کہتے، لیکن جہاں تک کسی کی خبر لینے کا سوال ہے۔ اگر مرزا سوداؔ سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ ادھر کسی سے ناراض ہوئے ادھر جھٹ اس کے خلاف ایک شکایتی خط لکھ کر اس کے افسر کو بھجوا دیا۔ اس کی جواب طلبی ہو گئی۔ اور یہ بغلیں بجا کر اترانے لگے۔ آپ بھی یاد کریں گے فتنہ بٹالوی سے پالا پڑا تھا۔

ایک دن فتنہ صاحب ریڈیو لائسنس بنوانے کے لئے ڈاکخانہ گئے۔ کلرک نے آپ سے قطار میں کھڑے ہونے کے لئے کہا۔ انہیں بہت ناگوار گزرا۔ اسوقت انھوں نے تو صبر سے کام لے کر کلرک کی بات مان لی، لیکن گھر آ کر پوسٹ ماسٹر جنرل کو ایک چٹھی لکھی جس میں کلرک مذکورہ کو پانی پی پی کر کوسا۔ یہ کلرک پرلے درجہ کا کام چور ہے۔ وقت مقررہ کے دو گھنٹے بعد کھڑکی کھولتا ہے۔ عوام کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ اس کی بد دماغی سے تنگ آ کر لوگوں نے لائسنس بنوانا بند کر دیئے ہیں۔

اس طرح گورنمنٹ کو ہزاروں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ ایسے نااہل کلرک کو فوراً برخاست کر دینا چاہیئے۔ اگر اُسے برخاست نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم معطل ضرور کر دینا چاہیئے۔ اگر کسی وجہ سے اُسے معطل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سخت تنبیہ کی جانی چاہیئے۔ ورنہ عوام کو مجبور ہو کر اس کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا جس کے نتائج کی ذمہ داری گورنمنٹ پر ہوگی۔

افسران بالا نے جب اس کلرک سے باز پرس کی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے فتنہ صاحب سے بڑی عاجزی کے ساتھ سوال کیا۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ نے میرے خلاف شکایات کا طومار باندھ دیا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "برخوردار! یہ جوابی حملہ ہے تمہیں شاید معلوم نہیں ہمارے قلم میں کتنی طاقت ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہم نے ایک انسپکٹر پولیس کو جو اپنے زعم میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، معطل کرایا ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو گے تمہارے سابقہ پوسٹ ماسٹر کو یہاں سے تبدیل کرانے میں کس کا ہاتھ تھا۔ تمہاری تو اوقات ہی کیا ہے۔ ہم نے تو بڑے بڑے طرم خان سیدھے کر دیئے۔

ڈاکخانہ کے کلرک کی خبر لینے کے بعد فتنہ صاحب نے ایک بینک کے کلرک کو راہ راست پر لانے کا تہیہ کر لیا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے دو بجے کے بعد فتنہ صاحب کے اصرار کے باوجود ان کے لئے ایک ڈرافٹ تیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے کلرک کو سخت سست کہا۔ تم خواہ مخواہ پبلک کو تنگ کرتے ہو۔ دو بجے کا وقت کوئی صورت تو نہیں جس کے ٹل جانے پر ڈرافٹ تیار نہیں کیا جا سکتا۔ جب کلرک ان کی سرزنش سے مرعوب نہ ہوا۔ انہوں نے مینجر سے شکایت کی۔ اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ جل بھن کر آپ سیدھے تارگھر پہنچے اور بینک کے جنرل مینجر کو ایک تار بھجوایا۔ جس میں کلرک

مذکورہ کے علاوہ مینیجر کی شکایت کرتے ہوئے جنرل مینیجر کو مداخلت کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد ایک مفصل خط میں انہوں نے انکشاف کیا کہ کلرک اور مینیجر بے ایمان اور رشوت خور ہیں۔ جب تک اُن کی مٹھی گرم نہ کی جائے کسی شخص کا کام نہیں کرتے۔ ڈرافٹ تیار کرنے کے لئے انھوں نے دس روپے طلب کئے جب ہم نے انکار کیا۔ انہوں نے ہمیں بینک سے دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ ان دونوں نے بینک میں عجیب دھاندلی مچا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے بینک کی ساکھ گر رہی ہے۔ ان کے خلاف اگر کارروائی نہ کی گئی تو بینک فیل ہو جائے گا۔

جنرل مینیجر نے کلرک اور مینیجر سے جواب طلب کیا۔ جب انہوں نے اُسے اصل ماجرہ سے آگاہ کیا۔ اُس نے فتنہ صاحب کی شکایت داخلِ دفتر کر دی۔ فتنہ صاحب کو بہت قلق ہوا۔ انہوں نے جنرل مینیجر کے خلاف ایک خط لکھ کر ایک مشہور روزنامہ میں چھپوانے کے لئے بھجوایا۔ ایڈیٹر نے اسے ایک فضول خط سمجھ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس کے اس سلوک سے فتنہ صاحب بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے ایک ذاتی خط اخبار کے مالک کو لکھا — آپ کا ایڈیٹر عقل اور تمیز سے عاری ہے۔ وہ نہایت فضول اور بے معنی ایڈیٹوریل لکھتا ہے۔ جب سے اُسے ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہے اخبار کا معیار گر گیا ہے۔ کبھی آپ کے اخبار کی ہر دلعزیزی کا یہ حال تھا، اخبار بین کسی اور اخبار کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کوئی شخص اسے مفت پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ آپ کے اخبار کا مستقبل خطرے میں ہے۔ اگر آپ نے اس نالائق ایڈیٹر کو برخاست نہ کیا تو عنقریب آپ کو اخبار بند کرنا پڑے گا۔"

جب فتنہ صاحب کی یہاں بھی دال نہ گلی انھوں نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں انھوں نے اشاروں اور کنایوں سے کام لینے

ہوئے اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کے خلاف خوب زہر اُگلا۔ اس پمفلٹ کو لے کر وہ ایک مجلس میں جاتے اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے "اگر ہم نے ان دونوں کو ساری دنیا میں ذلیل و خوار نہ کیا ہمارا نام فتنہ بٹالوی نہیں۔ آخر انہوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔"

گزشتہ ماہ فتنہ صاحب کے لڑکے کا جو کہ مقامی کالج میں پڑھتا ہے داخلہ روک لیا گیا وہ انگریزی اور حساب کے مضامین میں فیل تھا۔ فتنہ صاحب نے پروفیسروں سے اس کے نمبر بڑھانے کے لئے کہا۔ جب انھوں نے انکار کیا اُن کے خلاف ایک عرضی پرنسپل صاحب کو لکھ دی۔ جس میں اُن پر الزام لگاتے ہوئے لکھا ہمیں معتبر ذریعہ سے پتہ چلا ہے کہ انھوں نے دس روپے فی نمبر کے حساب سے فیل شدہ طلباء کے نمبر بڑھائے ہیں۔ یہ اُن طلباء کی ناجائز مدد کرتے ہیں جو ان کے پاس ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ ان کے خلاف ایکشن لیا جانا چاہیئے۔ ان کی وجہ سے کالج بدنام ہو رہا ہے۔

پرنسپل نے ان پروفیسروں کے خلاف انکوائری کرنے کے بعد فتنہ صاحب کو مطلع کیا کہ ان کے الزامات میں کوئی صداقت نہیں۔ فتنہ صاحب یہ بات کب ماننے والے تھے۔ انھوں نے پرنسپل صاحب کے خلاف ایک خط مینجنگ کمیٹی کے صدر کو لکھا۔ جب سے اس شخص نے کالج کا چارج لیا ہے۔ کالج تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ یہ اچھا استاد ہے نہ منتظم۔ اس کا اپنے اسٹاف اور طلبہ پر کوئی کنٹرول نہیں۔ یہ ضرورت سے زیادہ آرام طلب ہے۔ دفتر میں لیٹ آتا ہے۔ اکثر بیمار رہتا ہے۔ اگر یہ چند سال اور پرنسپل رہا تو کالج تباہ ہو جائیگا۔"
جب مینجنگ کمیٹی نے اس خط کا کوئی نوٹس نہ لیا فتنہ صاحب نے مینجنگ کمیٹی کی شکایت کرتے ہوئے یونیورسٹی کو لکھا۔ "یہ نااہلوں اور نامعقولوں

کی کمیٹی ہے۔ اسے برخاست کر کے یونیورسٹی کو نئی کمیٹی نامزد کرنا چاہیے ورنہ اس کالج کا خدا حافظ ہے۔

فتنہ صاحب سے ہر شخص پناہ مانگتا ہے۔ اکثر فخریہ لہجہ میں فرمایا کرتے ہیں اب تو محلے میں عورتیں اپنے بچوں کو خاموش کرانے کیلئے کہتی ہیں۔ چپ ہو جاؤ۔ نہیں تو فتنہ صاحب تمہارے خلاف بھی ایک خط لکھ دیں گے۔ یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ میر نے یہ شعر ہمارے لئے کہا تھا ؎

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے، جھگڑا ہے آسماں سے

اُن کا عقیدہ ہے اپنے سوا ہر شخص کو قابل مذمت سمجھنا چاہیئے۔ نیز آئے دن ایک نہ ایک فتنہ بپا کرتے رہنا چاہیئے۔ آخر کوئی فتنہ تو رنگ لائے گا۔ نہ بھی لائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم لوگ آپ کے وجود کو نظر انداز تو نہ کر سکیں گے!

شکوہ صاحب

ایک عام آدمی اپنے گھر کو گھر اور دفتر کو دفتر سمجھتا ہے، لیکن کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھر کو بھی دفتر سمجھتے ہیں۔ انہیں میں سے ہمارے ایک دوست اور پڑوسی شکوہ صاحب بھی ہیں۔ عمر پچاس سال۔ بدن اکہرا۔ سر کے بال کھچڑی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور رہ موچھیں۔ شکوہ صاحب کو دیکھ کر کسی سرکس کے جوکر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ جوکر نہیں۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کلرک ہیں۔ وہ جب دفتر سے گھر لوٹتے ہیں نہ صرف فائیلوں سے لدے پھندے ہوتے ہیں۔ دفتر کا ماحول بھی ان کے ہم رکاب ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر گھریلو گفتگو میں بھی دفتری اصطلاحیں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً بیگم پوچھتی ہیں۔ ہم نے نئی ساڑھی کی فرمائش کی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ وہ کہتے ہیں آپ کی فرمائش "زیرِ غور" ہے۔ مناسب وقت آنے پر اس پر کارروائی کی جائے گی۔ منّے نے جیب خرچ میں اضافہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ "منّے کی درخواست داخلِ دفتر کر دی گئی ہے۔ بجٹ میں گنجائش نہیں۔"

شکوہ صاحب کو اپنے دفتر کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ تاش اور شطرنج سے انھیں نفرت ہے۔ مطالعہ کو وہ تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ سینما اس لئے نہیں دیکھتے کہ اُن کی بینائی کمزور ہے۔ تیز کچھ اونچا بھی سنتے ہیں۔ لے دے کے ایک دفتر ہے جو ہمیشہ اُن کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ بقولِ غالب ؎

خزاں کیا فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اُن سے کسی موضوع پر بات کی جائے وہ اس کا رُخ دفتر کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ اور پھر گویا شکایتوں کا دفتر کھل جاتا ہے سب سے زیادہ رونا وہ اپنے سپرنٹنڈینٹ کا روتے ہیں۔ "صاحب! عجیب وحشی سے پالا پڑا ہے۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ ذرا سی لغزش ہو جائے۔ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔ پرسوں ہم دفتر میں ذرا دیر سے پہنچے۔ راستے میں آغا صاحب مل گئے تھے۔ خیر و عافیت پوچھنے کے لئے دو ایک منٹ ٹھہر گئے۔ جونہی اپنے کمرے میں قدم رکھا چپراسی نے مطلع کیا۔ صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ چل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اُن کے آفس میں داخل..... ہوئے انھوں نے گرج کر کہا۔ "آپ ہمیشہ دفتر میں لیٹ آتے ہیں۔ وجہ بیان کیجئے۔ آپ کے خلاف کیوں ایکشن نہ لیا جائے"؟ ہم نے بڑے انکسار کے ساتھ عرض کی "جناب آج پانچ منٹ لیٹ ہو گئے۔ ورنہ ہمیشہ دس منٹ پہلے آیا کرتے ہیں"۔ وہ میز پر مکا مارتے ہوئے بولے۔ "جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔ ہم دو ہفتوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ہر روز لیٹ آتے ہیں۔ دیر سے آنا آپ کی عادت بن چکی ہے"۔ جی میں آیا اُن سے کہیں۔ "خواہ مخواہ ماتحتوں کو تنگ کرنا آپ کا شیوہ بن گیا ہے"۔ لیکن مصلحت کا تقاضہ تھا کہ چپ رہیں۔ انہوں نے اپنا نادر شاہی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ آئندہ لیٹ آئے تو اس دن کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی"۔

ہم لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اپنے کمرے میں آئے۔ ابھی انہیں دل ہی دل میں اچھی طرح کوس بھی نہیں سکے تھے کہ اُن کا بلاوا پھر آیا۔ ڈرتے ڈرتے حاضر ہوئے انھوں نے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ان رقموں کی میزان آپ نے

لگائی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اس میں پندرہ پیسوں کی غلطی ہے۔"

"جلدی میں ہوگئی ہوگی۔"

"کیا مطلب۔ آپ سوچ سمجھ کر میزان نہیں لگاتے۔"

"کبھی کبھار احتیاط کے باوجود غلطی ہوجاتی ہے۔"

"یہ اچھی احتیاط ہے۔ ایک نہ دو پورے پندرہ پیسوں کی غلطی ہے۔"

"لائیے۔ اسے ٹھیک کردیتے ہیں۔"

"اگر پڑتال کئے بغیر ہم نے بھی دستخط کردیئے ہوتے اور افسرانِ بالا کی نگاہ اس پر پڑجاتی۔ تو۔۔۔۔۔!"

"معمولی غلطی ہے۔ ہمارا تو خیال ہے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جاتا۔"

"آپ کے نزدیک ہر غلطی معمولی ہوا کرتی ہے۔ گزشتہ ماہ بھی آپ کی میزان میں ایک غلطی نکلی تھی۔ یاد ہے آپ کو؟"

"وہ تو صرف تین پیسوں کی غلطی تھی۔"

"غلطی آخر غلطی ہے۔ تین کی ہو یا تئیس پیسوں کی۔ آئندہ ذرا ہوش سے میزان لگایا کیجئے۔ نہیں تو سخت نوٹس لیا جائے گا۔"

اس دوسری سرزنش نے ہمیں بالکل جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہم سوچنے لگے یہ افسر ہے یا قصائی۔ اگر ہفتہ عشرہ میں میزان کی ایک غلطی نکل آئی تو کون سا غضب ہوگیا۔ آخر کلرک کوئی کمپیوٹر تو نہیں ہوتا کہ اس سے کبھی غلطی سرزد نہ ہو۔

ہم شکوہ صاحب سے رسمی ہمدردی جتاتے ہوئے کہتے ہیں۔ "چھوڑیئے شکوہ صاحب دفتروں میں ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ وہ سپرنٹنڈنٹ کو چھوڑ کر

ہمارے پیچھے پڑ جاتے ہیں" آپ کی رائے میں یہ معمولی باتیں ہیں۔ آپ کا اس قماش کے افسر سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اس لئے آپ اس کی طرف داری کر رہے ہیں"

"ہم اس کی طرفداری نہیں کر رہے۔ آپ سے صرف موضوع بدلنے کے لئے کہہ رہے ہیں"

"آپ موضوع بدلنا چاہتے ہیں تو لیجئے۔ ہمارے دفتر میں دو کلرک ہیں"

"پھر وہی دفتر کی بات"

"دیکھئے صاحب۔ ہم نے موضوع بدل دیا ہے۔ اب آپ کو یہ قصہ سننا ہی پڑے گا"

"اچھا سنائیے" ہم بادلِ ناخواستہ کہتے ہیں۔

"صاحب! یہ دونوں کلرک آفت کے پرکالے ہیں۔ شیطان بھی اُن سے پناہ مانگتا ہے۔ ان میں سے ایک تو سپرنٹنڈنٹ کا رشتہ دار ہے۔ دوسرا اس کا چمچہ ہے۔ انھوں نے سازش کر رکھی ہے کہ ہمیں ذلیل و خوار کر کے ہی دم لیں گے۔ ہر وقت صاحب کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ شکوہ صاحب دفتر کی اسٹیشنری چرا کر گھر لے جاتے ہیں۔ شکوہ صاحب وقت سے پہلے گھر چلے جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں تو انھوں نے حد ہی کر دی۔ وہ قسمت ہی اچھی تھی ورنہ ہمارے برطرف کئے جانے میں تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی۔ آپ سن رہے ہیں نا؟ اونگھ تو نہیں رہے"۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ بڑے شوق سے سن رہا ہوں"

"ایک دن ہم نے صاحب کی ٹائیسٹ سے ہلکا سا مذاق کیا۔ اس کی بھنک انھیں پڑ گئی وہ فوراً اس خاتون کے پاس پہنچے اور اُسے بہکایا کہ وہ

ہمارے خلاف ایک شکایت لکھ کر صاحب کو دے۔ جب اُس نے آنا کانی کی تو اُسے دھمکانے لگے۔ مجبور ہو کر اُس نے اُن کی بات مان لی۔ ہمارے صاحب کو ایسا موقع خدا دے۔ انہوں نے ہم پر لگائے گئے الزام کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کہا۔ ہم بہت گھبرائے۔ اُس خاتون کے گھر پہنچے۔ بیوی بچوں کا واسطہ دیا۔ بڑی مشکل سے اُس خدا کی بندی کو اپنی شکایت واپس لینے پر راضی کیا۔ اس کے باوجود صاحب نے ہمیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ آئندہ محتاط رہیئے۔ نہیں آپ کو برخاست کر دیا جائے گا۔ تو ملاحظہ فرمائی آپ نے ان شیطانوں کی کارستانی"!

"اچھا شکوہ صاحب۔ اب دفتر کی کافی باتیں کر چکے۔ اب کوئی اور بات کیجئے۔ دیکھئے موسم کتنا خوش گوار ہو گیا ہے"!

"خاک خوش گوار ہو گیا ہے۔ جس کمرے میں ہم کام کرتے ہیں وہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ ہاتھ پیر سن ہو جاتے ہیں۔ کئی بار صاحب سے کہہ چکے ہیں کہ ایک "ہیٹر" کی منظوری دے دیجئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ہیٹر افسر والے کے لئے ہوتے ہیں۔ کلرکوں کے لئے نہیں۔ ہیٹر کی بات چھوڑ دیئے۔ پچھلے دو سال سے کہہ رہے ہیں۔ دو کرسیاں خریدنے کی اجازت دی جائے، لیکن وہ نہیں مانتے"!

ہم شکوہ صاحب کا دھیان دفتر سے ہٹانے کے لئے کہتے ہیں "شکوہ صاحب ہمارے ملک نے آزادی کے بعد کافی ترقی کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ نہایت بے دلی کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ "صاحب۔ آپ کہتے ہیں تو ملک نے ضرور ترقی کی ہو گی۔ لیکن ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ ہماری سالانہ ترقی تو تین سال سے رُکی ہوئی ہے۔ کئی بار لکھ چکے ہیں۔ کوئی شنوائی نہیں ہوتی"!

یہ سمجھتے ہوئے کہ تیر خطا ہوا ہم اس بار ریس کے گھوڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔
شکوہ صاحب اس مضمون سے ایک نیا پہلو نکال لیتے ہیں۔ "اجی صاحب آجکل گدھا گھوڑا ایک بھاؤ ہے۔ شرما صاحب ایف۔اے پاس ہیں۔ ہم بی۔اے ہیں، لیکن ہم دونوں کو ایک ہی گریڈ دیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے اس سے پہلے جو سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتے تھے ہمارے قدردان تھے، لیکن اب تو گھوڑے گئے گدھوں کا راج آیا۔"

اُن کی گفتگو کی تاب نہ لاکر ہم اُٹھتے ہوئے کہتے ہیں "اچھا شکوہ صاحب اجازت دیجئے، پھر کبھی حاضر ہوں گے"۔ کہنے کو تو ہم کہتے ہیں پھر کبھی آئیں گے، لیکن سوچتے ہیں جب بھی شکوہ صاحب سے ملاقات ہوگی وہ دفتر کا قصہ چھیڑ دیں گے اور حسبِ معمول بھول جائیں گے یہ گھر ہے دفتر نہیں اور جب ہم اُن سے عرض کریں گے:

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

تو وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے:

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

چچا سلیمان

نام تو ان کا کچھ اور ہے، لیکن ہم سب انھیں چچا سلیمان کہتے ہیں۔ چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سرخ، آنکھوں میں غضب کی چمک۔ بڑی بڑی مونچھیں جو بعض اوقات مصنوعی معلوم ہوتی ہیں اور مصنوعی دانت جن پر قدرتی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ چچا سلیمان بڑی بارعب شخصیت کے مالک ہیں۔ حفیظ جالندھری کے برعکس جن کا تجربہ تھا زندگی میں پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔ ان کا تجربہ ہے زندگی میں تجربے ہی تجربے ہیں۔ اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ وہ کون سا تجربہ ہے جس سے ہم دوچار نہیں ہوئے۔ بہتر برس کی عمر میں کیا کیا نہیں دیکھا۔ طوطا چشم احباب دیکھے، بدمزاج ہمسایوں سے پالا پڑا۔ زود رنج بیوی اور لاڈلے بچوں کے ناز اٹھائے، طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوئے۔ رسالہ نکالا شاعری کرتے رہے، ملازمت اختیار کی، معطل ہوئے، بحال کر دیئے گئے۔ پینشن پائی۔ الغرض کس کس سانحے کا ذکر کیا جائے۔

ان کا مرغوب ترین شغل نوجوانوں کو اپنے تجربات سے آگاہ کرنا ہے۔ ان کا تکیہ کلام ہے "عزیزو! تجربہ بڑی چیز ہے۔ ہماری باتیں پلّے باندھ لو۔ وگرنہ زندگی وہ پٹخنی دے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔"

ایک دن وہ برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہم ان سے آنکھیں چرا کر کھسکنا

چاہتے تھے کہ انھوں نے دیکھ لیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "پکڑے گئے نا؟" ہم آداب بجا لائے۔ بڑی شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ ڈرائنگ روم میں لے جاکر چاکولیٹ کھلائے۔ اس کے بعد حال چال پوچھا۔ ہم نے انھیں بتایا اگلے اتوار کو ایک ٹرپ کے ساتھ آگرہ جارہے ہیں۔ چچا کی آنکھوں میں یک لخت ایک چمک نمودار ہوئی۔ فرمایا برخوردار! آگرہ ضرور جاؤ لیکن تاج محل مت دیکھنا۔ نہیں تو تمہیں سخت مایوسی ہوگی۔"

ہم نے حیران ہوکر پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"ہمارا تجربہ ہے تاج محل اتنا خوبصورت نہیں جتنا اُسے سمجھا جاتا ہے۔ دراصل کوئی چیز اتنی دل کش نہیں ہوتی جتنا کہ اس کا تصور ہوتا ہے۔"

انہوں نے سگریٹ سلگایا اور دو ایک کش لگانے کے بعد بولے۔ "دیکھو عزیز تمہیں ایک تجربے کی بات بتاتے ہیں۔ زندگی میں کبھی ایسے تانگے میں سوار مت ہونا جس کا کوچوان کانا اور گھوڑا لنگڑا ہو۔ سوار ہونے سے پہلے ان دونوں باتوں کی تصدیق کرلینا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا۔ آج سے چالیس برس پہلے اُنھیں کسی ضروری کام سے دہلی جانا پڑا۔ جب اسٹیشن سے باہر آئے ایک ایسے تانگے میں سوار ہوگئے جس کا کوچوان کانا اور گھوڑا لنگڑا تھا۔ اس تانگے کا ایک بیل گاڑی سے تصادم ہوگیا۔ چچا بُری طرح زخمی ہوگئے اور پندرہ دن اسپتال میں رہے۔

ہم نے اُن کی دور اندیشی کی داد دیتے ہوئے پوچھا۔ "ٹیکسی کے متعلق کیا خیال ہے؟" "خوب یاد دلایا" انھوں نے کرسی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "کسی ایسی ٹیکسی میں سوار نہیں ہونا چاہیئے جس کا ڈرائیور سیاہ فام ہو جس کی

ایک آنکھ بیٹھی ہوئی ہو اور جس نے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی ہو۔ عموماً ایسا ڈرائیور ڈاکو ہوتا ہے۔ کانپور میں ہمارا واسطہ ایسے ہی ڈرائیور سے پڑا تھا۔ وہ ہمیں ایک ایسی سنسان جگہ لے گیا۔ جہاں ہم دونوں تھے یا خدا کی ذات تھی۔ وہاں ظالم نے پستول دکھا کر ساری نقدی چھین لی اور ہمیں سڑک کے کنارے چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔"

"اچھا اب اجازت دیجئے۔" ہم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی بیٹھو۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ تمہیں دو ایک تجربات سے روشناس کرائیں۔"

ہمیں با دلِ ناخواستہ بیٹھنا پڑا۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے۔ "کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ ہم اس وقت جوان تھے۔ ایک دفعہ گڑھوال کی پہاڑیوں پر شیر کا شکار کرنے گئے۔ ایک درخت پر مچان بنایا۔ درخت کے نیچے ایک بکرا کھونٹے سے باندھ دیا۔ آدھی رات کے بعد ہمیں شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔ ہمیں محسوس ہوا وہ بکرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم نے رائفل سے دو فائر کیے۔ شیر زور سے دھاڑا، اُچھلا اور زمین پر گر پڑا۔ ہم بہت خوش ہوئے، لیکن جب ٹارچ کی روشنی میں نیچے کی طرف دیکھا شیر کا نام و نشان نہ تھا۔ البتہ بکرا گولیوں کی تاب نہ لا کر دم توڑ رہا تھا۔

برخوردار! ایسی غلطی کئی شکاریوں سے ہو جاتی ہے۔ دراصل وہ مچان پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے ہیں۔ خواب میں انھیں شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ خواب سے بیدار ہو کر وہ اس پر فائر کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے وہ جانور جو انھوں نے شیر کو مچان کے قریب لانے کے لئے کھونٹے سے باندھا تھا مارا جاتا ہے۔ شیر کا شکار کرتے وقت یہ احتیاط ضروری ہے کہ شکاری چوکنا رہے کیونکہ اصلی اور خواب میں

دیکھے گئے شیر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ویسے ہمارا خیال ہے شیر کا شکار کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ شیر فطرتاً ایک شریف جانور ہے۔ بھیڑیئے اور چیتے سفاک واقع ہوئے ہیں۔ شیر کا شکار کرنے کے بعد ہمیشہ افسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ ہم نے ایک درویش کو قتل کر دیا۔"

"بہت خوب۔" ہم نے اُن کے آخری فقرے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے ہماری پیٹھ ٹھونکی اور بولے۔ "اچھا برخوردار چلتے چلتے تمہیں دو نہایت کار آمد نکتے بتا دیں۔ پہلا یہ کہ کبھی اخبار کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیئے۔ دوسرا یہ کہ ایسے مقرر کی بات پر ایمان نہیں لانا چاہیئے جو یہ کہے کہ صرف دو منٹ کے لئے سامعین سے خطاب کرنا چاہتا ہے۔"

"وجہ؟" ہم نے پوچھا۔

"اخبار میں جو خبریں دلچسپ ہوتی ہیں، جھوٹی ہوتی ہیں اور جو سچی ہوتی ہیں۔ غیر دلچسپ ہوتی ہیں۔ عموماً اخبارات میں دردناک سانحوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس بات کا رونا ہوتا ہے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس قسم کی پیشینگوئیاں ہوتی ہیں قحط پڑنے والا ہے۔ جنگ چھڑنے والی ہے۔ ایسی خبریں پڑھ کر قاری حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اب رہا اداریہ۔ اس سے زیادہ خشک اور اُکتا دینے والا صفحہ شاید ہی اخبار میں ہوتا ہوگا۔ ہمارا تجربہ ہے اگر اخبار پڑھنا ہی پڑے صرف اشتہارات پڑھنے چاہئیں۔ یہ کافی دلچسپ اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ ہر ایک اشتہار میں کوئی کافر ادا حسینہ قارئین کو دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کسی خاص چیز کو خریدنے کی سفارش کرتی ہے جسے وہ کبھی نہیں خریدتے کیونکہ اشتہار پڑھنے کے بعد انہیں حسینہ یاد رہتی ہے۔ اور جس چیز کو خریدنے کی اس نے سفارش کی تھی بھول جاتی ہے۔"

"آپ نے مقرر کے متعلق بھی کچھ فرمایا تھا؟"

"یاد رکھو جو مقرر تمہید کے طور پر کہتا ہے دو منٹ کے لئے تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل درجے کا جھوٹا ہے۔ دو منٹ میں دو چار نعرے لگائے جا سکتے ہیں۔ تقریر نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے جونہی وہ یہ الفاظ زبان پر لائے مجلس سے اٹھ کر گھر کا راستہ لینا چاہیئے۔ بصورت دیگر وہ تمہیں دو گھنٹے "بور" کرے گا اور جب اُس کی تقریر ختم ہوگی، تم سوچو گے خدا جانے اس شخص کے پاس جو گھڑی ہے وہ اُس نے کون سی فرم سے خریدی ہے کہ اس کا ایک منٹ دوسری گھڑیوں کے ایک گھنٹے کے برابر ہوتا ہے۔"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور نئے نئے تجربوں سے لدے پھندے گھر لوٹے۔

جب کسی تقریب کے سلسلے میں خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے ہیں اُس وقت چچا سلیمان کی طبیعت رنگ پر آتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں نوجوانوں نے محفل جما رکھی ہے۔ دو ایک منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد آمدم بر سرِ مطلب والا معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ نوجوان انھیں چھیڑنے کے لئے عجیب و غریب سوالات کرنے لگتے ہیں۔ وہ ان کے جوابات کچھ اس انداز سے دیتے ہیں کہ ہنسی کے فوّارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ اُس وقت اُن کی حیثیت اُس سیاست داں کی ہوتی ہے جس نے اپنی پریس کانفرنس میں صرف شوخ اور بے باک نامہ نگاروں کو مدعو کیا ہو۔ ایک نوجوان پوچھتا ہے ـــ

"آپ کے خیال میں کس قسم کی لڑکی سے شادی کرنا چاہیئے؟"

وہ اُس کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کرنے کے بعد کہتے ہیں۔ "تم بہت شریر ہو گئے ہو۔ بڑے اوٹ پٹانگ سوال کرتے ہو۔"

"پھر بھی اس معاملے میں آپ کا تجربہ کیا ہے؟"

"ہمارا تجربہ ہے کہ ہر ایک لڑکی میں ایک نہ ایک عیب ضرور ہوتا ہے۔ کوئی حسین ہے، لیکن ذہین نہیں۔ کوئی حسین اور ذہین ہے، لیکن باتمیز و باسلیقہ نہیں۔ کسی کی آنکھیں خوبصورت ہیں، لیکن ناک موٹی ہے۔ کسی کی ناک ستواں ہے لیکن لب نازک نہیں، اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ جس قسم کی بھی لڑکی مل جائے اس سے شادی کر لینا چاہیئے۔"

ایک اور نوجوان لقمہ دیتے ہوئے کہتا ہے "آپ کا مطلب ہے چاہے وہ بہری، گنجی یا کانی ہو۔"

"برخوردار" وہ اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "بہری بیوی تو ایک نعمت ہے۔ اُسے کتنا سخت سست کہہ لو وہ ناراض نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ گنجی بیوی کے لئے آپ مصنوعی بال خرید سکتے ہیں اور کانی بیوی تو ظاہر ہے سب خاندان کے افراد کو ایک آنکھ سے دیکھے گی، اس لئے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ لڑکی پسند کرتے وقت صرف ایک چیز کا خیال رکھنا چاہیئے یعنی اس کی زبان ماپ لینا چاہیئے۔ اگر وہ گز بھر کی ہے تو چاہے لڑکی حسین ماہ جبین ہے۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ نہایت تعلیم یافتہ ہے اُسے دور ہی سے سلام کرنے میں خیریت ہے۔"

اب اُن سے سوال کیا جاتا ہے۔ محبت کے متعلق آپ کا کیا تجربہ ہے؟ وہ سنجیدگی کے جملہ آثار اپنے چہرے پر طاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کسی خاص خاتون کو باقی سب خواتین پر ترجیح دینے کا نام محبت ہے۔ اصل میں محبت ایک نہایت غیر جمہوری فعل ہے۔ کیونکہ جمہوریت میں تمام عورتوں کے حقوق مساوی ہوتے ہیں۔ محبت، ہوس یا جنسی تشنگی کا ایک شاعرانہ نام ہے۔

یہی وجہ ہے شعراء اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ عام طور پر فرضی محبوبوں سے محبت کرتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ کیونکہ اُن میں سے بیشتر اتنے بدشکل ہوتے ہیں کہ بدصورت سے بدصورت عورت بھی ان سے پناہ مانگتی ہے۔"

"ہپیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" کوئی منچلا سوال کرتا ہے۔

"ہپی کہاں میاں انھیں تو بھگوڑے کہو۔ یہ لوگ زندگی سے بھاگ کر زندگی میں ہی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ خدا کے بندے بھول جاتے ہیں کہ اپنے ملک سے ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک میں سکونِ دل کی تلاش کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ زندگی تو ہر جگہ وہی ہے۔ ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک شاعر دہلی میں تنگدست رہنے لگا۔ ایک دن اُس نے حیدر آباد جانے کا قصد کیا۔ وہ اپنے استاد کو الوداع کہنے کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ استاد کو جب پتہ چلا وہ حیدر آباد جا رہا ہے اُس نے کہا "میاں! حیدر آباد کے خدا کو ہمارا اسلام کہدینا۔" شاگرد نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا حیدر آباد کا خدا کوئی اور ہے۔" استاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اگر اور نہ ہوتا تو دہلی چھوڑ کر حیدر آباد کیوں جاتے۔"

سیاست سے شغف رکھنے والا ایک نوجوان پوچھتا ہے۔ "جمہوریت کے متعلق آپ کا کیا تجربہ ہے؟" چچا سلیمان جواب میں کہتے ہیں "تم نے نہایت معقول سوال کیا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے جمہوریت میں زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ مگر دماغ سوچنا بند کر دیتا ہے۔ جمہوریت کو اس لئے پسند کیا جاتا ہے۔ کیونکہ عوام گفتار کو کردار پر ترجیح دیتے ہیں۔ جمہوریت تب تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ہر ایک شخص یہ اعتراف نہیں کرتا کہ اس کا ہمسایہ نہیں وہ خود پاجی ہے۔ ہمارا تو یہ بھی تجربہ ہے جب تک انسان کو فٹر اور

بھیڑیئے کی خصلتیں ترک نہیں کرتا کوئی طرزِ حکومت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

جو نظامِ دل نہ بدل سکا تو نظامِ دہر کا کیا گلہ
وہی لذتیں ہیں گناہ میں وہی تلخیاں ہیں ثواب میں

اور چچا سلیمان کی پریس کانفرنس مجلس وعظ کی طرح تادیر چلتی رہتی ہے۔ ادھر بے چارہ میزبان فریاد کرتا رہتا ہے کہ لنچ کو دیر ہو رہی ہے، لیکن جب چچا سلیمان اور نوجوان ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو پھر لنچ کی کون پرواکرتا ہے!

آخری الفاظ

عظیم رہنما کوکا کولا پی رہے تھے کہ یک لخت ان پر فالج گرا اور اس سے پہلے کہ وہ پکار کر کہتے ـــــ بوتل کو مرے ہاتھ سے لینا کر چلا میں ـــــ وہ چل بسے۔ اُن کے انتقال پر ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ مرحوم اپنے آخری دنوں میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے۔ جنہیں سن کر داغؔ کا یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا تھا ـــــ وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا!

مرحوم کی وفات پانے کی مسرت سب سے زیادہ اُس جیوتشی کو ہوئی جو ہر سال اُن کے مرنے کی پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور جس نے تنگ آکر یہ اعلان کیا تھا۔ اگر عظیم رہنما فلاں تاریخ تک اللہ کو پیارے نہ ہوئے تو میں خودکشی کر لوں گا۔

مرحوم کے ساتھیوں نے بذریعہ قرعہ اندازی ایک نائی کو ان کا جانشین مقرر کیا۔ اس کا نام ماتادین تھا۔ نئے رہنما نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "ایک ممتاز رہنما میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہو اور وہ عوام کا سر مونڈ سکے۔ خدا کے فضل سے مجھ میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں، اس لئے قوم کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

قوم نے ماتادین کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور ساتھ ہی مطالبہ کیا

کہ اُسے مرحوم رہنما کے آخری الفاظ سے آگاہ کیا جائے۔ ماما دین اچھی طرح جانتے تھے کہ موت نے مرحوم کو الوداع تک کہنے کا موقع نہ دیا تھا۔ چہ جائیکہ وہ قوم کے لئے کوئی پیغام دے سکتے، لیکن قوم یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا جو شخص اپنی زندگی میں اتنا باتونی ہو کہ آئے دن اپنی تقریر سے عوام کو بور کرتا رہے وہ مرتے وقت کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ ماما دین نے وعدہ کیا وہ ایک ہفتہ کے بعد عوام کو مرحوم کے آخری الفاظ سے آگاہ کریں گے۔

سب سے پہلے ماما دین نے مرحوم کی بیوی سے انٹرویو کیا۔ "ہمارے محبوب رہنما اور آپ کے فرشتہ سیرت شوہر نے موت سے دو ایک دن پہلے آپ سے کیا گفتگو کی تھی؟"

اُس نے جواب دیا: "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں صداقت سے کام لوں تو آپ کو ان کی گفتگو کے بارے میں بڑی مایوسی ہوگی۔"

"پھر بھی انھوں نے کیا کہا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا تمہارا جوبن اتنی جلدی ڈھل جائے گا۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں تم کو طلاق دے دوں۔"

"اس کے علاوہ اور کیا باتیں ہوئیں؟"

"یہ کہ تم خواہ مخواہ میری مے نوشی پر اعتراض کرتی ہو۔ تم جانتی ہو شراب پئے بغیر میں نشہ بندی پر تقریر نہیں کر سکتا۔"

"اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ یہ کہا تھا جب ہماری شادی ہوئی تھی تو تم میکے سے اپنے ساتھ ایک خادمہ لائی تھیں جو بہت قبول صورت تھی، لیکن دو ماہ

کے بعد تم نے اُسے ملازمت سے جواب دے دیا تھا محض اس شک پر کہ وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی۔ میں تمہارے اس گناہ کو آج تک معاف نہیں کر سکا۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا انھوں نے؟"

"انھوں نے کہا تھا حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ کسی وقت بھی کوئی بڑا دھماکہ ہو سکتا ہے، اس لئے مناسب ہو گا ہم بیس پچیس لاکھ روپیہ کسی غیر ملکی بینک میں جمع کرا دیں اور جوں ہی عوام بغاوت کا جھنڈا بلند کریں۔ بذریعہ ہوائی جہاز یہاں سے بھاگ نکلیں۔"

"تو کیا انھوں نے اتنا روپیہ کسی بینک میں جمع کرا دیا تھا؟"

"نہیں۔ کیونکہ دوسرے دن اُن کا انتقال ہو گیا۔"

مرحوم رہنما کی بیوی نے جتنی بھی باتیں بتائی تھیں۔ اُن میں سے کوئی بھی کام کی نہ تھی، اس لئے ماتادین نے مرحوم کے بڑے لڑکے سے سوال کیا۔ "آپ کے والد نے آپ سے آخری ملاقات کے دوران کیا کہا تھا؟"

"انھوں نے مجھے بیوقوف، چغد، نالائق وغیرہ کہنے کے بعد نصیحت کی تھی کہ غریب لڑکیوں کا تعاقب نہیں کرنا چاہیئے۔ چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں۔ اگر عشق کرنا ہی ہے تو کسی رئیس کی لڑکی سے کرنا چاہیئے تاکہ جہیز میں کافی روپیہ ملے۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا انھوں نے؟"

"جی ہاں۔ یہ کہا تھا۔ تم متواتر چار سال سے بی۔ اے کے امتحان میں فیل ہو رہے ہو۔ تمہاری کامیابی کا انحصار صرف دو باتوں پر ہے۔ امتحان دیتے وقت تمہیں نقل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں اور ممتحنوں سے مل کر تمہیں رعایتی نمبر دلائے جائیں۔"

"مرحوم رہنما آپ کو کون سا پیشہ اختیار کرنے کے لئے کہتے تھے؟"

"اُن کا کہنا تھا اپنے وطن میں بہترین پیشہ سیاست ہے۔ اُن کی دلی خواہش تھی میں اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قوم کی رہنمائی کر سکوں۔"

"وہ سیاست کو بہترین پیشہ کیوں سمجھتے تھے؟"

"وہ کہتے تھے اس پیشے میں سرمایہ لگائے بغیر انسان سرمایہ دار بن سکتا ہے۔"

"کیا وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھے؟"

"جی ہاں۔ اُن کی اپنی مثال اُن کے سامنے تھی۔ وہ ایک غریب تیلی کے بیٹے تھے۔ جسے دو وقت کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا۔ لیکن سیاست میں حصہ لینے کے بعد اُن کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق میں فرمایا کرتے تھے۔ میں تیلی کا بیٹا ہوں۔ قوم کا تیل نکال کر چھوڑوں گا۔"

مانا دین کو یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ اب انھوں نے مرحوم کی بڑی صاحبزادی سے بات کی۔ اُس نے انہیں بتایا کہ مرحوم نے اپنی موت سے ایک دن پہلے اس سے کہا تھا "پرانے زمانے اور آج کل کی لڑکی میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ وہ لڑکیوں میں کھیلتی تھی اور یہ لڑکوں میں کھیلتی ہے۔ تم کافی سمجھدار ہو پھر بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ کہیں کسی ایسے نوجوان کے جال میں پھنس نہ جانا جو قرض کی مے پیتا اور ٹکٹ کے بغیر سفر کرتا ہو۔ لڑکی وہ ذہین ہوتی ہے جو امیر ترین شوہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔"

اس انٹرویو کے بعد مانا دین نے مرحوم کے کسی رشتے دار سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔ حسنِ اتفاق سے انھیں مرحوم کی ایک ذاتی ڈائری مل گئی جس میں کئی قسم کے اندراجات تھے۔ مانا دین بڑے غور سے ان کا مطالعہ کرنے لگے۔

۱۸ فروری کو مرحوم نے لکھا تھا۔ آج کا دن بہت اچھا رہا۔ مس میم سے

ملاقات ہوئی۔ چھوکری بُری نہیں۔ چالاک بھی کافی معلوم ہوتی ہے۔ سونے کی اسمگلنگ میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ کوئی شک بھی نہ کرے گا۔ میں نے اُسے منافع میں دس فیصد کی پیشکش کی ہے لیکن وہ ابھی نہیں مانتی۔ اُمید ہے پندرہ فی صد پر مان جائے گی۔

۴ر مارچ۔ سیٹھ دگاف لام ٹین کا کوٹا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر پچاس ہزار بطور نذرانہ دے سکیں تو انھیں کوٹا دلوا دینا چاہیئے۔

۲۵ر اپریل کو انھوں نے ایک ایسی دعوت کا ذکر کیا تھا جس کے آخر میں ایک مشہور رقاصہ نے نیم برہنہ حالت میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ مرحوم نے رقاصہ کے خدوخال کو چٹخارے لے لے کر بیان کیا تھا۔

۱۴ر مئی کو انھوں نے صرف دو سطریں لکھی تھیں۔ سیاست اور ایمانداری میں کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں ایماندار سیاستدان سے زیادہ بیوقوف شخص مشکل سے ملے گا۔

ماتا دین جوں جوں ڈائری کے اوراق پلٹتے گئے اُن کے چہرے کا رنگ اُڑتا گیا اور اس اندراج پر تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا "اس خوبصورت بیوہ کو بیوی بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ڈاکٹر ایل سی سے مل کر اپنی بدصورت رفیقۂ حیات کو زہر دے دیا جائے۔"

ماتا دین نے ڈائری بند کر دی اور فیصلہ کیا کہ خود ہی ایک بیان لکھ کر اُسے مرحوم رہنما کے آخری الفاظ کا نام دے دیا جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے:

پیارے ہم وطنو! کاش میں کچھ برس اور زندہ رہتا اور آپ کی مزید خدمت کر سکتا۔ لیکن افسوس خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ عزیزو! میں نے ہمیشہ قومی مفاد کو

ذاتی مفاد پر ترجیح دی ۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کوشش کی کہ ہر قسم کی رشوت خوری ختم کی جائے۔ نشہ بندی تحریک کو کامیاب بنایا جائے ۔ مادی اقدار کی بجائے روحانی اقدار کی سرپرستی کی جائے۔ ہوس پرست شوہروں کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنی بدصورت بیویوں سے نفرت نہ کریں ۔ جہیز کی لعنت کا قلع قمع کیا جائے۔ بیواؤں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے ۔ ایسی فلموں اور کتابوں پر مقدمے چلائے جائیں جو نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کرتی ہیں ۔ مجھے یقین ہے اگر قوم نے میرے ان آخری الفاظ پر عمل کیا تو اس کا مستقبل نہایت تابدار ہوگا"۔

ایک ہفتے بعد سب ماتا دین نے مرحوم رہنما کے آخری الفاظ قوم کو پڑھ کر سنائے تو اس نے بیک زبان ذوقؔ کا یہ مصرع دہرایا۔

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے!

کنہیا لال کپوُر

کنہیا لال کپوؔر سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ شاید وہ ملاقات کوئی اہم واقعہ نہ ہو یا شاید کپوؔر اس کا اہل نہ ہو کہ پہلی ملاقات پر کوئی گہرا نقش چھوڑ جاتے ——— (یا شاید میرے مادۂ قبولیت میں بھی کوئی نقص ہو سکتا ہے)

لیکن اب یہ عالم ہے کہ کپوؔر سے ملنے کے لئے طبیعت میں اُبال سا اُٹھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ حسین و جمیل کا مالک ہے نہ اس کے لمبے تڑنگے قد میں کوئی کشش ہے اور نہ اس کی گفتگو اور لب و لہجہ میں کوئی نچی تلی شائستگی ہے۔ صرف ایک لیڈی کٹ عینک کے سوائے اس کی پوری شخصیّت میں کوئی چیز چمکیلی نہیں ہے ——— بدن کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہر شخصیّت کے جسم میں سے کچھ خاص قسم کی لہریں نکلا کرتی ہیں۔ ان لہروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی لہریں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ مگر دوسری قسم کی لہریں دھکے دے دے کر اپنے سے دُور پھینکتی ہیں۔ کپوؔر کے نصیب میں دوسری قسم کی لہریں لکھی ہیں جو جسم سے پھوٹتی ہیں تو انسان کو بھگا دیتی ہیں۔ سیّد سجاد ظہیر اور کپوؔر مذکرہ بالا دونوں قسم کی لہروں کے دو الگ الگ نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود میرا عالم یہ ہے کہ میں کپوؔر سے ملنے کے لئے مضطرب ہوا اُٹھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میرے اپنے عالم یعنی میری اپنی لہروں میں کوئی گڑبڑ ہے، ورنہ کپوؔر کے لئے مضطرب ہونا کہاں کی دانش مندی ہے؟

فکر تونسوی